

پندرہویں اورنگ زیب

اس کتاب کا صرف باب ہم کتنا حیران کن مقصد تھا لکھنے والے کا اظہار باب مذکور کی کیا ہے اسکی تائید کے لئے مواد کی ضرورت تھی۔ لہذا باب دوم لغات باب نہم لکھنے کے جن میں زیادہ تر ہندوستان کی وہ تمدنی حالت دکھائی گئی ہے جو عہد اورنگ زیب میں تھی اور اسکے ثبوت میں ایک ایسے انگریز سیاح و تاجر کے سفر نامے سے اقتباسات کئے گئے ہیں جسے عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور جکا تفصیلی حوالہ مہمید میں دیا گیا ہے۔ میں جناب کی خدمت میں یہ کتاب اس غرض سے روانہ کرتا ہوں کہ جن مسائل پر تاریخی واقعات کی مدد سے نئے باب دوم کے تینوں حصوں میں بحث کی ہے انکے متعلق جناب کی آزادانہ رائے معلوم کرنے کا مجھے شرف حاصل ہو تاکہ اپنے ہندوستان برادران وطن کے ہر طبقہ کے اصحاب کے اصلی خیالات و جذبات سے مجھ کو آگاہی ہو جا سکے اور انکی مدد سے میں اپنی رائے میں اصلاح کر سکوں۔ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ جناب کی رائے جناب کے نام گرامی کیا تہہ بیک میں یا آئندہ کسی مضمون میں بغیر آپ کی اجازت کے نہ پیش کروں گا۔ جواب دینے کی نسبت میرا مطالبہ درخواست کسی قدر سخت ہے اور اس سے آپ کی تفسیر اوقات ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن میں اس کتاب کے متعلق کوئی مفصل مکمل تقریر نہیں چاہتا بلکہ صرف تبادلہ و درستی خیالات مقصود ہے۔ اس لئے اگر ان مسائل پر کم از کم چند سطروں میں بھی آپ اپنی ذاتی آزادانہ رائے تحریر فرمادیں گے تو میرا مقصد حاصل ہو جائیگا اور اس کے لئے کل کتاب کے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ صرف باب دوم کے تینوں حصوں کا مطالعہ کافی ہو گا۔ میں بحیثیت ایک کترین خادم قومیہ درخواست کرتا ہوں کہ انکی تائید فرمائی جائے۔ فقط

بَابِ اَوَّل

تہیہ

نامِ نیکِ فستگان ضائع کن تا بماند نامِ نیکت برقرار

”زمانہ“ کے پانچ واپرین ۱۹۲۳ء کے پرچہ میں مٹرجے۔ آر۔ راجا جی ایک مضمون لکھا تھا۔ جن کا عنوان یہ تھا ”ہندوستان عہدِ مغلیہ میں“ مضمون مذکور میں چند واقعات بیان کر کے اُن سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عہدِ مغلیہ میں رشوت کا بازار بے حد گرم تھا۔ راجا یا مغلوں کا حال بھی اور بہت افلاس و تنگدستی میں سرکرتی عوام کی اقتصادی و تمدنی حالت سنوارنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی ورنہ سلطنت نیک نفس، مردم شناس و منظم نہ تھی۔ تجارت پر ایسی تباہ کن قیود عائد تھیں کہ جن سے اوس کی ترقی و شہوار تھی۔ صداقت نا بود تھی، فرامین شاہی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ سمندری بحری قزاقوں کے بیڑے پھر اُکرتے تھے۔ اندرون ملک راہزنوں کا بڑا زور تھا۔ مغلوں کا لشکر ایک بے قاعدہ فوج کا مجموعہ تھا۔ بڑا حصہ زمین کا ویران اور غیر آباد تھا۔ کالج اور تعلیم گاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔

میرزا صاحب نے اپنے مضمون کی تائید میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے اُن خطوط کا حوالہ دیا ہے جو مختلف اوقات اور زمین میں انہوں نے ولایت کو اپنے آقاؤں کے لئے ارسال کیا

دینے کی غرض سے لکھے تھے اور ایک فرانسیسی سیاح کی تحریر سے بھی تدلال کیا ہے
 مسٹر جے۔ آر۔ رائے جیسے اس مضمون نے پہلے مجھ کو صرف یہ خیال دلایا تھا کہ
 ”ہندو عہد اور رنگ زیب“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جائے لیکن ہندو
 مسلمانوں کے آجکل کے نزاعوں سے اس اندیشہ نے کہہیں ایسے مضامین سے
 جن میں صحیح واقعات کا اظہار نہ ہو غلط فہمی بڑھ کر ملک کے حالات بد سے بدتر نہ
 ہو جائیں۔ میرے خیال کو مصمم ارادہ کر دیا۔ صحیح ہے کہ یہ مضمون تلخ کی
 وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس میں موز کی حیثیت سے عہد اور رنگ زیب کے نام
 واقعات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس میں زیادہ تر عہد اور رنگ زیب
 کے وہ چند واقعات پیش کئے گئے ہیں جنکو عہد مغلیہ اور رنگ زیب کے متعلق اصحاب
 رائے عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان واقعات کا انتخاب کیسان الگرنڈر ملہٹن نے
 سفر نامے سے کیا گیا ہے۔ الگرنڈر ملہٹن ایک انگریز سیاح و سوداگر تھا۔ شخص علمی
 حیثیت سے بھی معمولی شخص نہ تھا۔ یونیورسٹی میں تعلیم پا چکا تھا تقریباً ۱۸۴۸ء میں
 جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا یہ شخص بہت سا سوداگری مال و اسباب لیکر مع چند
 توپوں اور تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ولایت سے روانہ ہوا ہے اور تمام
 افریقہ و عرب و ایران پر تجارت کرتا ہوا بالآخر ہندوستان کے ساحل پر پہنچا ہے
 تخمیناً ۲۵ برس تک ہندوستان اور اس کے گرد و نواح میں اپنی زندگی بسر کی ہے
 اس شخص نے اپنا ایک سفر نامہ لکھا ہے جسکی دوسری طبع ۱۸۳۹ء کی ہے۔ یہ سفر نامہ
 دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسوقت ”کتب خانہ آصفیہ“ حیدرآباد دکن میں موجود ہے
 یہ کتاب پرانی انگریزی میں لکھی گئی ہے لیکن بہت دلچسپ ہے۔ چونکہ یہ سوداگر

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ لہذا اکثر اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرس اور ان کے ملازمین کی پولیس کی حرکات و رچا کو پرتفیدی نظر بھی لائی۔ غالباً اس وقت کپتان صاحب کو اس کا خیال بھی نہ ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وہ چالبازیاں جن کو انہوں نے اپنے سفر نامے میں نظرتحرارت سے دیکھا ہے بالکل ان کی قوم کی حکومت اس ملک میں قائم کر دیں گی۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ ہے جس کے ہمارے بعض مورخ ہونے کے مدعی سب سے زیادہ متعصب مسلمان مغل بادشاہ ظاہر کرتے ہیں۔ ساحل ہندوستان پر کوئی ایسا بڑا شہر نہ تھا کہ جہاں یہ مصنف نے کیا علاوہ بریں سورت، احمد آباد، دہلی، آگرہ، کلکتہ وغیرہ کی بھی اس نے سیر کی ہے ایک موقع پر اورنگ زیب کے روبرو بھی پیش کئے جانے کی عزت اس کو حاصل ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس شخص کا علم ذاتی ہے اور اس کے بیانات بادی النظر میں بے غرض اور بے لوث معلوم ہوتے ہیں میں نے اپنے مضمون میں کپتان موصوف کی اسی عینی شہادت پر استدلال کیا ہے اور جو شہادت میں پیش کرتا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو ان واقعات کی بہت کچھ تکذیب ہوتی ہے جن پر سٹرجس۔ آر۔ راجا نے اپنی رائے قائم کرنے میں استدلال کیا ہے۔ اب راجا یہ امر کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتے یا ڈائرکٹرس غلط واقعات کیوں لکھتے ہیں کے متعلق ناظرین اولاً اس مضمون کے باب (۹) کو ملاحظہ کریں اس کے بعد وجوہ خود ذہن میں آ جائیگی فرانسیسی سیاح کی بابتہ جبکی کتاب کا حوالہ سٹرجس۔ آر۔ راجا نے دیا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ امر قابل غور ہوگا کہ اس سیاح کے ذرائع علم کیا تھے۔ اس نے کس زمانہ میں اور کتنے روز تک اس ملک کو دیکھا۔ بالآخر ناظرین

یہ میں التجا کروں گا۔ کہ اگر اس مضمون کی کوئی عبارت خلاف مزاج ہو تو معاف فرما
 کسی کا دل دکھانا میرا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اس مضمون کا اصلی مقصد یہ ہے کہ آ
 گزشتہ صحیح تاریخی واقعات سے لاعلمی یا غلط فہمی نے ہندو مسلمانوں کے دلوں پر ایک
 دوسرے کے مقابل کوئی عبارت پیدا کر دیا ہے تو اسکے دھونے کی کوشش کروں اور
 اگر اس مضمون سے انجی باہمی محبت و ارتباط کی رنجیر کو کچھ بھی تقویت حاصل ہو سکے
 تو میرا اصلی مطلب حاصل ہو جائے گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین !!

باب دوم تعلیمی حالت

مِٹرجے۔ آری راضا جانے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ عہد مغلیہ میں کالج اور درسگاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا تقریباً ۱۶۹۹ء میں کپتان ملہن خلیج فارس سے ہوتے ہوئے ساحل ہندوستان پر آئے ہیں سب سے پہلے انہوں نے اس جگہ ہندو کو دیکھا ہے جو سندھ کے نام سے موسوم ہے۔ سندھ میں ایک شہر تھا جس کا نام ”ٹٹا“ تھا۔ ہندوستان کا یہ پہلا شہر تھا جو ان کو پہلے پہل نظر آیا وہ لکھتے ہیں۔
 ”ٹٹا شہر علوم فقہ و فلسفہ و ریاضیات کیلئے مشہور ہے ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے تقریباً چار سو کالج یہاں ہیں۔“

جلد اول صفحہ ۱۲
 اگر ایک سندھ کے ساحل کی یہ حالت تھی تو اس زمانہ میں پائے تخت کے قریب قریب شہروں کی تعلیمی نظر سے کیا حالت ہوگی۔ اسکا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے اصلیت یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں تعلیم کا نقطہ نظری زمانہ موجودہ سے علیحدہ تھا۔ اور اس کے طریقے جدا تھے۔ پڑانا ایک ایسا نیک کام خیال کیا جاتا تھا کہ اس کا معاوضہ ہی نہیں سکتا تھا۔ استاد کا درجہ والدین سے کم نہ تھا۔ پڑانا ایک مغز پیشہ تھا۔ بہت سے لوگ اس کو باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور اس کام کو خوشی سے انجام دیتے تھے اور آج تک اسی کا یہ اثر ہے کہ جب ہم لفظ ”مولوی“ کسی کے نام ساتھ سنتے ہیں تو دل میں قاف و عزت کے خیالات آجاتے ہیں علاوہ بریں ہر رُسن محلہ کے لئے اپنے دروازے پر ایک

مکتب کا قایم کرنا ویسا ہی اسکی ریاست کے لوازمات میں سے تھا جیسا کہ گھوڑے
 ہاتھی کا یا لٹایا گرندھی رسم و رواج کی پابندی کرنا۔ اس مکتب میں صرف اس
 رئیس ہی کے بچے پڑھتے تھے بلکہ تمام غریب اہل محلہ کے بچے مولوی صاحب کے پاس
 پڑھنے کے لئے بیٹھائے جاتے تھے۔ نقد کی صورت میں مولوی صاحب کو بہت کم
 ملتا تھا۔ مگر اس طرح بہت سے لڑکے پڑھ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نہ صرف
 پڑھاتے تھے بلکہ آداب بھی سکھاتے تھے۔ اگر لڑکے نے ذرا سی بد تہذیبی کی تو مان
 باپ بھی مولوی صاحب کے حوالہ سے بچہ کو ڈراتے تھے۔ لڑکے کے کیر کڑ درست
 کرنے میں انکو بہت دخل تھا۔ ہم اس زمانہ کے اسکول اور کالجوں کے خلاف
 نہیں ہیں لیکن ہماری رائے میں اس ملک کے واسطے ابتدائی تعلیم گاہوں کا
 مکتب کی صورت میں ہونا بہترین طریقہ تھا۔ افسوس کہ رفتار زمانہ نے اس قسم کے
 مولویوں اور مدرسین کا طبقہ ہی نیست و نابود کر دیا۔ مکتبوں کے تعداد کی جو
 حالت بحشم خود میں نے بچپن میں اپنے چھوٹے سے قصبہ امیٹھی میں دیکھی ہے اس
 میں قیاس کر سکتا ہوں کہ ملک میں انہی مجموعی تعداد موجودہ پرائمری اسکولوں سے
 کم نہ ہوگی۔ اس قصبہ امیٹھی میں ایک ویرانہ سنان مقام ہے جہاں کچھ عرصہ
 چند بلا سقف دیواریں کھڑی ہوئی تھیں اب تو شاید صرف بنیاد کے نشا
 باقی رہ گئے ہیں۔ پرانے لوگ اسی کو وہ مقام بتلاتے ہیں جہاں طلباء و دُور
 دراز فاصلہ سے آکر قیام کرتے تھے اور ملا جیوں مرحوم جن کو ایک زمانہ تک
 اوزنگ زبیب کے اُتار ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا تھا درس دیا کرتے تھے
 یہ اس قصبہ کے ان کہنڈروں میں سے ہے جو ہم لوگ اہل قصبہ حسرت کی نگاہ سے

سے دیکھا کرتے ہیں۔ ہم اس کو اپنے قصبہ کا پرانا کالج سمجھتے ہیں۔ اسی قسم کے مکتبوں اور کالجوں میں ہندو مسلمان لڑکے یکجا پڑھا کرتے تھے۔ یہیں پران کوڑوں مذاہب کے بچوں میں دوستی کے وہ استوار رشتے قائم ہوتے تھے جن کو آئندہ توڑنا دشوار ہوتا تھا۔ ان مکتبوں کے علاوہ جہاں عام تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی درسگاہیں بھی تھیں۔ مثلاً ہندو پاٹ شالہ یا کسی سرپرست یا حافظ جی کا قیام گاہ۔ کپتان ہلٹن نے اپنے سفر نامہ میں صرف ایک مقام ”طط“ میں جو چار سو کالجوں کا ذکر کیا ہے غالباً وہ ایسے ہی مکتب مدرسے اور کالج ہونگے۔ جن کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اور جب کہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت کی یہ حالت ہو تو میسٹر جے۔ آر۔ راجنما کا یہ دعویٰ کہ اُس عہد مغلیہ میں درسگاہوں اور کالجوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔ یا تعلیم کے ذرائع اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موجود نہ تھے۔ میری رائے میں محض بلا ثبوت معلوم ہوتا ہے۔

— باب سو —

مذہبی رواداری

مذہبی رواداری کے معاملہ میں کپتان ہلٹن کی رائے کا پورا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو پہلے یورپ کی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہئے۔ کپتان ہلٹن اُس ملک کے باشندے تھے جہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی خانہ جنگیوں نے ہزاروں نہیں بلکہ

لاکھوں بنی نوع کا خون بہا دیا تھا۔ یہاں اُس زمانہ کی رعایا اگر گورنمنٹ و حکومت کے مذہب سے اختلاف کرتی تھی تو رعایا کے واسطے بہت مہلک نتائج پیدا ہو کر تھے۔ مثلاً ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء میں بادشاہ فرانس نے یہ حکم دیدیا تھا کہ سر میں تمام پرنسٹنٹ مذہب کی رعایا کا قتل عام کر دیا جاوے۔ اس عام فرمانِ قضائے بچے، بوڑھے، مرد و عورت کا کچھ استثناء اور امتیاز نہ تھا۔ بادشاہ نے کٹی ہوئی گردنوں سے خون کے فوارے نکلنے کا نظارہ اپنے مکان سے بیٹھ کر تماشے کے طور پر دیکھا۔ اسی صبح سے جب ولایت میں شاہزادی "میری" Mary کی جو کہ رومن کیتھولک تھیں تخت نشین ہوئی تو ایک نوجوان شاہزادی کی منہی سی خوبصورت گردن پہر پر رکھوا کر اس بنیاد پر کٹوا دی کہ وہ پرنسٹنٹ ہونے کا علانیہ دعویٰ کرتی تھی۔ راجر Rodgers کے دس بچوں اور بیوی پر حرم نہ کیا گیا۔ بلکہ اُسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے اُن کو زندہ جلا دیا گیا۔ یورپ میں اُس وقت مذہبی رواداری کی یہی حالت تھی۔ لہذا کپتان ٹملٹن کو عہد اورنگ زیب کی مذہبی رواداری دیکھ کر عجیب و غریب سماں معلوم ہوا۔ بہت بڑی بات جو کہ اُن کو متحیر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں مگر ایک دوسرے سے اس طرح بل جل کر بسر کر رہے ہیں اور وہ مذہبی تعصبات سے اس قدر بری ہیں کہ اُن میں سوائے پوشاک کے کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی تھی جس سے اُن کا امتیاز ہو سکے کہ اُن کا مذہب کیا ہے۔ اپنے سفر نامہ میں ایک مقام پر شہر ٹہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے

”ریاست کا مسلم مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندوئیں تو ایک مسلمان ہے“
 ”ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے وہ اپنے برت رکھتے
 ”اور تہواروں کو اسی طرح سے مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود
 ”ہندوؤں کی تھی۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن انہی بیویوں کو اجازت نہیں
 ”کہ شوہروں کے مرنے کے ساتھ تسی ہوں“ (جلد اول صفحہ ۱۲۷-۱۲۸)

ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:-

”صرف بنیوں میں عام فتنے ہیں اور گو ایک دوسرے کے ساتھ ملکر کھانا نہیں کھاتے“
 ”ہیں لیکن آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ برہمن ہمیشہ لوگوں کو اسکی ترغیب یا کرتے
 ”کہ دیوتاؤں کے واسطے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیجائیں۔“

”پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں عیسائیوں
 ”پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض
 ”وہ اسمیں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عیسائی بموجب ہیں ان کے اخلاق
 ”اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے عموماً بدترین ہوتے ہیں۔“ (جلد اول صفحہ ۱۵۹-۱۶۱)

یہ سیاح و تاجربہ سورت میں پہنچا ہے تو وہاں کی مذہبی حالت حسب ذیل الفاظ میں
 بیان کرتا ہے:-

”اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن انہیں کبھی کوئی سخت جھگڑائے
 ”ان کے اعتقادات و طریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اعتبار کہہ دیجئے
 ”چاہے اپنے طریقہ سے اپنے مبعود کی پرستش کئے۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو
 ”تکلیف نہ آئے اور آزار نہ پہنچا نا ان لوگوں میں بالکل مصفوحہ ہے۔“ (جلد اول صفحہ ۱۶۲)

ہم اُن مورخین سے جن کی کتابیں ہم کو اسکول میں پڑائی گئی تھیں یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ اخلاقی جرم نہ تھا کہ انہوں نے اس قسم کے واقعات اپنی تاریخ میں نہیں درج کئے۔ کیا وہ لاعلم تھے۔ یا اُن کی سیاسی اغراض اسکی متقاضی تھیں کہ وہ تمام ہندو مسلمان بچوں کے دل میں یہ خیال قایم کریں کہ اورنگ زیب ایک مستعصب مسلمان تھا جس نے ہمیشہ ہندوؤں کا گلا کاٹا۔ یہ وہی خیالات ہیں جو بعض اوقات ہمارے بعض تعلیم یافتہ ہندو برادران و طرح طرح کے دلوں میں آتش عداوت کو شعلہ کر دیتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی اور وہ جن لوگوں کو لاندہمی کے راستہ پر جاتا دیکھتا تھا ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتا تھا مثلاً جب کبھی وہ کسی مسلمان کو خلاف شرع کوئی فعل کرتا دیکھتا تو وہ اُس کو خود اسی کی شرع کے مطابق سزا دینا فرض سمجھتا تھا۔ ملک کہن میں اورنگ آباد کے قریب ایک مقام دولت آباد ہے۔ وہاں کی روایت ہے کہ اس عظیم الشان جلیل القدر فقیر مرثیہ بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے کلام مجید لکھ کر اور یہی سے جو رسم وصول ہوتی تھی اُس کے سرمایہ سے چند گز زمین اُسی مزار کے قدموں کے قریب خریدی تھی جس اُس کو روحانی بیعت تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ اُسی زمین کو اسکی نعش پڑ جائے اُس پر نہ عمارت ہو نہ مقبرہ ہو۔ سبز گہاس کافی ہے۔ اور قبر ایسی بنائی جائے کہ اس کے پیر طریقت کے مزار ہونے سے جو پانی بہے وہ اس بادشاہ کی قبر پر سے گزرے اُس کے پاس ایک مدرسہ جو ہمیں بچوں کو کلام مجید کی تعلیم دیتا ہے۔ میں نے اس مقام کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آج تک اُس وصیت کی پابندی ہو رہی ہے۔ حال میں اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن نے ایک سنگ مرمر کا کٹھنہ

اس قبر کے گرد بنوا دیا ہے۔ اس سے اورنگ زیب کی مذہبی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مگر جس مذہب کا رنگ اس کی طبیعت پر چڑھا ہوا تھا وہی مذہب اس کو مذہبی رواداری کی تعلیم دیتا تھا یہی مذہب یہ لکھار پکار اس سے کہتا تھا۔

الاکرامۃ فی اللہ

(علامہ محمدیازہ یوم)

(مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں)

دولت آباد کے جس دامن کوہ پر اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے کچھ دن بسر کئے اسی نیچے چند قدموں کے فاصلہ پر وہ غار مائے ایلورہ واقع ہے جہاں بدھ اور ہندو زمانہ کے مذہبی مندروں و بتوں کی سنگ تراشی دیکھنے کے لئے آج بھی یورپ اور امریکہ کے لوگ آتے ہیں۔ اُسی ضلع میں اچھٹہ کے وہ مذہبی غار میں خبی نقاشی و حکا اس زمانہ میں بھی ایک فرانسیسی ماہر فن گویا سکھ میں لگیا۔ اگر اورنگ زیب کا نصب اس قسم کا ہوتا کہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا تو اس وقت اس کے لئے ان آٹا کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا کچھ دشوار نہ تھا لیکن سوائے مذہبی خیال کے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خود اورنگ زیب ہی یا اس کے حکم سے کسی نے اُن میں ماتھ لگایا جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ دوسرے مذاہب کی رواداری نہ تھی ہر اپنے مذہب کے مطابق عمل کر سکتا تھا۔ ہر شخص آزاد تھا۔ ہر شخص مذہب چاہتا تھا اختیار کر لیتا تھا۔ جب میں ملک کہن کے قلعہ گو لکنڈہ و قلعہ کریم نگر کو دیکھنے گیا تو ایک منظر ایسا دکھائی دیا جس کا اثر میرے دل پر بہت خوشگوار تھا۔ قلعہ گو لکنڈہ و کریم

ہندو زمانہ کے میں انہی چوٹیوں پر اب تک ہندو پرستش ہیں موجود ہیں مسلمانوں نے ان قلعوں کو فتح کرنے کے بعد ہندوؤں کی ان عبادت گاہوں کو نیست و نابود نہیں کیا۔ ہندو وہاں تیرتھ کیلئے آج بھی جاتے ہیں یہ دیکھ کر مجھ کو مسلمانوں کی مذہبی رواداری پر فخر ہوا ایک ہی اللہ کے بندے ایک ہی خدا کی پرستش میں عالم میں کس کس طریقہ سے کر رہے ہیں مسلمان ہندو کو ان کی تبلیغ کرتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کیلئے کسی پتھر کو واسطہ قرار دینے کی ضرورت نہیں تو اس زمانہ میں ان کی تائید کی تو یہ پتھر گزرنے والے ہو گا اگر مسلمان ہندو کو اپنا وطن بنا کر رہنا چاہیں اگر مسلمان ہندو اپنی مادر شریفہ چھوڑ کر تھیں تو اس زمین میں بچے پیدا ہوں گے اور انہی کو اور تعلیم اور مذہبی رواداری کا ہونا ان کے قیام زندگی کیلئے لازمی۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ مغلیہ میں تبلیغ اسلام کبھی نہ گورنمنٹ و حکومت کی شاخ قرار دی گئی نہ مغلیہ بادشاہوں نے تبلیغ اسلام کبھی بنیامرضیہ سمجھا البتہ یہ اور بات ہے کہ مولویوں کے اثرات اور بعض خدا پرست مسلمانوں کے طرز زندگی سے عوام الناس کے دل متاثر ہوئے اور مذہب اسلام کی نادرگی اور اس کی تعلیم کہ خالق کی نظر میں سب انسان برابر ہیں ہندوستان کے باشندوں کے اس حصہ کو جو ذات پات کی زنجیروں میں گرفتار تھے ایک خوشگوار منظر معلوم ہوا اور خود بادشاہ کا مذہب بھی ایک خاص وقت رکھتا ہے ان وجوہ سے مسلمانوں کی تعداد میں کمی قدر اضافہ ہوا مگر ہندوستان میں تبلیغ اسلام کبھی باقاعدہ و باضابطہ طریقہ سے نہیں کی گئی جیسے کہ اس وقت مذہب عیسوی کی تبلیغ مشہور کرتے ہیں مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس کا بیڑا نہیں اٹھایا۔ خیر یہ بوجہ معترضہ تھا۔ عہد اورنگ زیب میں مذہبی رواداری کی بات

رائے قائم کرنے کی غرض سے اپنے موجودہ تمدن کو ذرا گہری نظر سے دیکھئے اور ہندوستان کے اُن حصص میں جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھے کسی پرانے شہر کے پرانے محلے میں قدم رکھئے خواہ دہلی ہو اگر ہو یا لکھنؤ یا کسی قصبے میں جائے۔ خواہ ایٹھی ہو اکا کوری ہو یا جگوا تو کیا نظر آئے گا کہ ایک ہی دیوار کے سایہ میں ان دونوں مذاہب کے لوگ امن و امان سے پستہ پست زندگی بسر کر چکے ہیں اور اسی کا اب بھی یہ اثر ہے کہ ایک ہی بنیا۔ بزاز۔ حجام۔ مالی۔ لوہار۔ سنار۔ دونوں کی روزانہ ضروریات پوری کر رہے۔ مسلمانوں نے علیحدہ ہٹ کر کوئی سول انیس نہیں قائم کیں ابھی میں خاص سے محلہ کے ہندو بچے میرے والد کو اسی طرح سے چچایا دادا کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ جیسے کہ میرا فرض تھا کہ اپنے والد سے ملنے والے ہندو احباب کو خطاب کروں۔ اگر قدیم سے نہر سی رواداری نہ ہوتی تو تمدن کے بڑے بڑے آثار اس طرح سے آج کیونکر باقی رہتے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تمدن اب سرعت سے مٹا چلا جا رہا ہے۔ جس کے اسباب پر غور کرنے کا یہ موقع نہیں گرا اب بھی جا بجا اُن لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے اس نہر سی رواداری کی آب و ہوا میں پوری نشوونما پائی ہے مجھ کو امید ہے کہ میرے معظم و مکرم راجہ راجایاں سرکشن ریشاد مہاراجہ بہادر بہن السلطنت جی سی۔ آئی۔ اے۔ ای مجھ کو معاف فرمائیں گے۔ اگر ان کی ایک خانگی تحریر کا ذکر کر دوں گا کہ مطابق ۱۹۲۲ء میں عید الضحیٰ کے موقع پر اپنے اہل اسلام جناب کو مہاراجہ جنامہوج نے ایک مبارکباد لکھی تھی چنانچہ مجھ کو بھی کمال عنایت سے

یاد فرمایا تھا اُس تحسیر کی نقل کرتا ہوں۔

هُوَ الْكَلِمُ الْمَجْمُوعُ

خدا کہنے پہ کہتے ہیں نہیں پتا کہ اگر پر اُتتا کہتا ہو کہتے ہیں خدا کہتے
مری وحد پرستی ٹرگئی انشا فطی نہیں کچھ کہتے بتا ہے اگر کہتے تو کیا کہتے
یہ جھگڑے تو چلے تیجائے شائبہ محبوب نوید آمد عید محی الضم کہتے
میں اپنے جوابی شکر یہ کے خط کے چند جملے نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

”اگر ہندو مسلمان ہندوستان کے دو دریا ہیں تو آپ ان کے سنگم میں۔ اگر ہندو“

”مسلمان ایک جسم کی دو آنکھیں ہیں تو آپ ان کا فوکس اور وہ نقطہ ہیں جہاں“

”دونوں نجی روشنی مل جاتی ہے۔ افسوس! ہندوستان میں ایسے نفوس کی ہزار ہا ہیں“

المختصر مہاراجہ صاحب اس ملک کے قدیم تمدن کے عظیم الشان نمونہ ہیں کیا اُحلام

مذہب ہندو مسلمان میں گہری دوستی قائم ہونے کا کبھی مانع ہوا؟

میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ کبھی مانع نہیں ہوا۔

ابیشو سہائے مرحوم لکھنؤ کے ایک محلہ ”عیش باغ“ میں رہتے تھے۔ طالب علمی کی

حالت میں انہوں نے ایک کلب قائم کیا تھا جس میں بحیثیت طالب علم میں بھی

شریک ہوا۔ ہماری دوستی کے پتنگ اتنے بڑھے کہ ایک ساتھ خور و نوش میں

حار نہ رہا جب جون ۱۹۱۹ء میں معلوم ہوا کہ میں امتحان بی اے میں کامیاب

ہو گیا۔ اُس وقت تک بابوشیو سہاگل۔ یل۔ بی پاس کر چکے تھے مثل ایک بڑے
 بھائی کے انہوں نے مجھ کو حکم دیا کہ اسی سال نومبر کے مہینہ میں مجھ کو یل۔ یل۔
 بی کے امتحان میں شریک ہونا پڑیگا۔ میرا دل رجمان طبابت و ڈاکٹری
 کی طرف تھا لیکن انہوں نے قانون کیلئے مجبور کیا۔ اُس زمانہ کے قواعد کے
 بموجب لاکچرس ایف۔ اے کے ساتھ ساتھ میں نے پورے کر لئے تھے۔ پھر بھی
 زمانہ بہت کم تھا علاوہ بریں ایم۔ اے میں بھی شریک تھا۔ طبیعت چمکاتی
 تھی۔ میں تو کا نڈھا ڈالے دیتا تھا۔ بابوشیو سہاگل نے کہا نہیں۔ تم کو اپنی
 سال شریک ہونا پڑے گا۔ میں اپنے اس ہندو دوست کی شفقت کو کبھی نہیں
 بھولوں گا۔ دن دن بھر میرے لئے قانون کی کتابوں کے خلاصے بناتے تھے
 مجھے رات کو اکڑ پڑاتے تھے۔ ہالینڈ جو ریسرڈنس کا مشہور بابوشیو سہاگل
 کا خلاصہ جو بعد کو انہوں نے طبع کرایا اور جس سے سینکڑوں یل۔ یل۔ بی
 کے طلباء فیضیاب ہوئے اُن کی اسی زمانہ کی تصنیف ہے۔ ۱۷ جولائی ۱۸۹۲ء
 کو میں نے قانون پڑھنا شروع کیا۔ ۲۶ نومبر ۱۸۹۲ء کو امتحان یل۔ یل۔ بی
 شروع ہوا جب جنوری ۱۸۹۳ء میں میرے پرنسپل مسٹر وٹھائیٹ نے الہ آباد
 یونیورسٹی کے قانونی امتحان کے اشاعت نتیجہ کی تمغی سے واپس آکر مجھے کونسل
 سے قبل بدخبر پہنچائی کہ میں اول درجہ (فرسٹ ڈویژن) میں کامیاب ہوا۔
 جب خیر سہاگل بابوشیو سہاگل کے کانوں تک گئی تو ان کی مسرت کا اندازہ ہو
 میرے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بابوشیو سہاگل مرحوم ہندو تھے۔ مسلمان نہ تھے
 لیکن کیا یہ اختلاف سچی دوستی کا مانع ہوا؟ ان باتوں کے لکھنے سے میرا یہ

نہیں ہے کہ ہندوستان میں آج کے قبل ہندو مسلمانوں میں مذہبی جھگڑے کبھی نہیں
 ہوئے بلکہ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ اس ملک کی عام حالت ہندو مسلمانوں
 میں مذہبی رواداری کی رہی ہے۔ عام طور سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ امن و امان
 کے ساتھ رہتے رہتے رہے ہیں۔ یہ ہمارا اصلی تمدن اور نگ زیب کے زمانہ میں تھا اور
 اب بھی بہت کچھ باقی ہے جس کی نظر سے موجودہ زمانہ کے حالات مجھ کو مجبور کرتے
 ہیں کہ اصل مضمون سے کس قدر ہٹ کر عام مذہبی رواداری کے متعلق اظہار رائے
 کروں۔ اور پہلے میں اہل اسلام سے پوچھتا ہوں جو کہ اپنی زندگی میں سینکڑوں
 بلکہ ہزاروں مندروں کے پاس سے ہو کر گزرے ہیں کہ کیا ان مندروں کو
 کو دیکھ کر کبھی بھی کوئی جوش اُن کے دل میں اس قسم کا پیدا ہوا کہ وہ مندر سما
 کر دے جائیں یا اُن کی صورت اُن کی آنکھوں کو ناگوار معلوم ہوئی اور اگر
 ایسا ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں اور اسی طرح اُن اہل ہندو سے بھی
 پوچھتا ہوں جو ہزاروں مسجدوں کے پاس سے ہو کر روزانہ گزرے ہیں کہ کیا
 صرف اُن مسجدوں کو دیکھ کر کوئی مذہبی ولولہ اُن کے دل میں پیدا ہوا اور
 اگر ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہماری تہذیب و
 اذان اہل ہندو کے لئے ایک معمولی صدا ہو گئی ہے اسی طرح عام اہل اسلام کو ناگوار
 صرف ایسا ہی شے معلوم ہوتی ہے جس میں سے سانس اور ہوا کے زور سے ایک
 بلند آواز نکلتی ہے اس میں اور عیائیوں کے کلیے گھنٹوں میں کیا فرق ہے؟
 مسلمانوں کو نہ مندر کی عمارت سے کوئی خاص دشمنی ہے اور نہ ناقوس
 کی آواز سے کوئی خاص نفرت ہے۔ جو کچھ فرق ہے وہ خدا کے تصور میں پتھر اور اینٹوں

کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آخر مسجد و مندر و ناؤ کے جھگڑے بعض اوقات ہیبت ناک صورت میں جا بجا کیوں پیش آجاتے ہیں اور ان سے وہ ناگوار اور تکلیف دہ نتائج کہ جن کا خیال کرنا بھی لہر میں بند صلح جو دل کو رنج فرما ہوتا ہے۔ نمودار ہوتے ہیں۔ میری دانست میں اس قسم کے تنازعات کی ابتدا میں صلی نذہبی جو شہ کو اس قدر دخل نہیں ہوتا جتنا اعتراض ذاتی اور نفسانیت کو ہوتا ہے جن کی جڑ جہالت و انسانی کمزوریاں ہیں مثلاً بعض اوقات کسی مقام کے چند سربراہان اور وہ اشخاص ہیں کوئی خصوصیت قبل سے چلی آتی ہے محض اسکی بنا پر وہ کسی نذہبی رسم کی انجام دہی کے موقع پر مذہب کی آڑ میں اس طرح کچھ امور پیش کر دیتے ہیں کہ لوگوں کو برا بھلا سمجھتی ہے اور اس کے بعد عام مسلمان اور مندوں کی شرکت اور پارٹی بندی خود داری کے اصول پر شروع ہوتی ہے اور اسوقت کسی ذاتی خصوصیت، غرور و خود داری سے وہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو ہم صرف نذہبی جو شہ پر محمول کرتے ہیں بعض اوقات ہمارے اوکام بھی ایسے تنازعات کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر اہل ہندو نے عشرہ محرم میں مسجد کے قریب باجا بجا دیا یا ناؤں میں بھونک دیا تو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس سے غرض ہماری تو ہیں تھی خواہ دراصل یہ غرض ہو یا نہ ہو شہر النہض لوگ جاگزیں بھی کرتے ہیں کہ توہین کرنا مقصود تھا۔ پھر خود داری کا مادہ مثل باد مند کے اس شعلہ کو بھڑکا دیتا ہے بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب ایک مقام پر ایک ہی وقت دونوں فرقے اپنے نذہبی رسم ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تب چند لوگ ایسے بھی نمودار ہو جاتے ہیں جنکو

مذہبی جس کو کچھ نہیں ہوتا لیکن لالچی، تلوار، اور چھروں کی زور آزمائی میں
لطف آتا ہے۔ یہ تو عام صورتیں ہیں کہیں کہیں شل ذوناور مذہبی جوش کو بھی
داخل ہو جایا کرتا ہے۔ مگر یہ عام صورتیں ایسی نہیں ہیں کہ اس ملک میں مذہبی رواداری
قائم رکھنے کے لئے ایک غیر ہندوستانی قوم کا دائمی تسلط لازمی ہو۔ یہ عام صورتیں
انسانی خلقت اور کمزوریوں کے وہ شعلے اور چنگاریاں ہیں جو ہر ملک میں
ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں نکلا کرتی ہیں اور جب تک انسان باقی ہے نکلا کرے گی
ان کا انساو بہت کچھ حکومت کی انتظامی قابلیت پر منحصر ہے اور ان کو ہندو
استد تعلقی نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ آج ایسا کون ملک ہے جہاں
انسانوں کے جذبات سے بعض اوقات خونریزی کے نتائج نہیں پیدا ہو جاتے
اگر ہندوستان میں کبھی کبھی مذہبی جھگڑے ان کے باعث ہوا کرتے ہیں تو یورپ
کے ممالک میں آئے دن کی ہڑتال اور سیاسی امور میں اختلاف رائے اسی قسم کے
فسادات کے موجب ہو جاتے ہیں ایسے ممالک جیسے جرمنی، یونان، اٹلی
فرانس، اٹرلینڈ، وانگلستان میں بھی وقتاً فوقتاً ان جذبات کے اظہار
ایک دوسرے کا سر توڑنے پر لوگ آمادہ ہو جاتے ہیں جس ملک کی آبادی مسیحی
۲۲ کروڑ ہو اس میں کبھی کبھی جھگڑوں کا پیش آنا کوئی تعجب خیز
بات نہیں ہے۔

جیسا کہ مہاتما گاندھی نے بھی فرمایا ہے! اس کا خوف نہ کرنا چاہیے
کہ برٹش ہندیا میں بحالت خود مختاری ہندو مسلمانوں کو ہمضم کر جائیں گے یا مسلمان
ہندوؤں کے مذاہب کو نیست و نابود کر دیں گے۔ جب کئی سو برس کی اسلامی حکومت

یہ نہ کر سکی تو پھر اس صدی مسلمان کیا کریں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے تنازعات کو مذہب سے زیادہ تعلق نہیں ہے اور ان کا انسداد کافی انتظام سے ہو سکتا ہے۔

اے بھائیو! گزشتہ صدیوں میں اپنی انتظامی قابلیت سے اس قسم کے تنازعات کا سد باب کرتے رہے اور آئندہ بھی کر سکو گے۔

اگر مجموعی حیثیت پر غور کیا جاوے تو ہندوستان کی بڑی بڑی دیہی ریاستوں میں مذہبی رفاکاری پریش اندیہ سے کم نہیں ہے اور اس قسم کے تنازعات کو رفع کرنے میں ان کی انتظامی قابلیت کسی طرح پریش اندیہ کے حکمرانوں سے کم نہیں ہے۔

اے برادرانِ وطن! مایوس نہ ہو۔ مجموعی حیثیت سے تم میں رفاکاری کا کافی مادہ اب بھی موجود ہے۔

باب چہارم تجارت و تمول و فاع البالی

اورنگ زیب کے زمانہ میں مہند کی تجارت و تمول و فاع البالی کی وجہ سے
 تہی اس کا حال پُرکرم کو اپنے موجودہ افلاس پر افسوس معلوم ہوتا ہے جبکہ کڑو
 بنی نوع انسان کو سوائے ایک وقت کے دوسرے وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا ہے
 اورنگ زیب کے زمانہ میں تجارت سے دو طرفہ تمول بڑھتا تھا۔ باہمی تجارت
 کرنے والے دونوں ملک دولت سے مالا مال ہوتے تھے۔ مہندوستان کا بشما
 مال ولایت پرنگال، ہالینڈ اور فرانس کو جایا کرتا تھا اور اسی طرح سے ان
 ممالک کے لوگ مہندوستان کو مال بھیجتے تھے۔ اس باہمی مساوات سے اس ملک
 کے تجارت کی یہ حالت تھی کہ کیمان ملٹن ایک مقام پر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ
 عبدالغفور نامی ایک سوداگر سورت میں رہتا ہے جس کا سرمایہ تجارتی اسٹیٹ
 انڈیا کمپنی کی کل تجارت و سرمایہ کے برابر ہے۔

”میں نے دیکھا ہے کہ ایک سال میں مال کے تقریباً (۲۰) جہاز بھر کر وہ بھیجا ہے پرا
 جہاز ۳۰۰ سے لیکر ۸۰۰ ٹن کا تھا۔ اور ہر ایک میں صرف اس کا مال س ہزار ٹن
 اور بھنوں میں ۲۵۰۰۰ ٹن کا تھا۔ اور جب یہ مال باہر روانہ ہو چکا تھا
 تب بھی اس سے زیادہ مال اس کے پاس آئے سڈہ کے لئے باقی رہتا تھا“

جلد اول صفحہ ۱۴۷-۱۴۸

ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ مہندوستانیوں کے پاس بے بڑے عمدہ جہاز ہیں

ہندوستانی انگریز ملاحوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر حبشیت کپتان اور میٹ ملازم رکھتے ہیں۔ (جلد اول صفحہ ۲۳۳)

ملا باہر کے کنارے پر ایک قوم آباد تھی جو غالباً اب ”پاپلا“ کے نام سے مشہور ہے اسکی نسبت لکھا ہے کہ یہ لوگ یورپ کے برعظیم کو چمیلیاں پہنچتے ہیں عام طور سے لوگ ہندوستان سے لوہا قیمتی جواہرات و چوبیسہ اسی کرتے تھے ایک قسم کا رنگ بھی بھجایا جاتا تھا جسے چھینٹ اسی خوبصورت چھپتی تھی کہ بقول ہٹلن دنیا میں کہیں کا رنگ اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے خود بھی میسور کے عجائب خانہ میں ہندوستان کی پرانی چھینٹ دیکھی ہے جو کہن اس مالک سے جایا کرتا تھا اسکی نسبت بھی کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یورپ میں اس سے بہتر ذائقہ کا کہن دستیاب ہونا دشوار تھا۔

ہندوستان کا کپڑا ایسا عمدہ ہوتا تھا کہ اسکی مالک نہ صرف ولایت میں بلکہ ایسے مقامات پر بھی تھی جیسے پلگو و سہاڑا وغیرہ

(جلد اول صفحہ ۲۹۶ - ۳۵۰)

جنوبی ہند کے بڑے بڑے ہندو راجہ تجارت کیا کرتے تھے۔ ساحل ہندو کے جنوبی حصہ سے جب کپتان صاحب کا جہاز گذرا تو ان کو ایک مقام پر خف سنا ٹیکس راجہ صاحب کو ادا کرنا پڑا جب کپتان صاحب راجہ صاحب سے ملاقات کرنے گئے اور غالباً ٹیکس کی شکایت کی تو راجہ نے کہا کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے فرض کرو کہ غیر اقوام کے لوگ ولایت بغرض تجارت جائیں تو ان سے بھی وہاں ٹیکس لیا جائے گا۔ علاوہ بریں ہم لوگ تمہاری جان و مال کی حفاظت کے

ذمہ دار میں لہذا ایسا خفیہ ٹائیکس لینا ایک واجب بات ہے۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۹)

شاہی ٹیکس جو تاجار کو دینا پڑتا تھا وہ بھی بہت کم تھا۔ تجارتی مال پر سلاٹوں سے (۲) فیصد می ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اور عیسائیوں سے (۳) یا (۱/۲) فیصدی لیکن مسلمانوں کو ایک اور دو سر ٹیکس بھی اپنے مال پر دینا پڑتا تھا جو وہ نقص تھا۔ کپتان ملٹن صاحب نے اسکو "پال ٹیکس" لکھا ہے۔ یہ پال ٹیکس عیسائیوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہو گا کہ مجموعی حیثیت سے ٹیکس کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ مزید برآں انگلستان کے تاجار پر ابتداء اس قدر اعتبار کیا جاتا تھا کہ جب وہ مال ساحل ہندوستان پر آتے تھے تو فوراً کوئی محصول اُن سے نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ آخر سال میں حسبِ حال واقعی فروخت ہوتا تھا۔ اُس پر انہیں کے خیالی عمل پر اعتبار کر کے محصول لیا جاتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایٹ انڈیا کمپنی نے اس معاملہ میں زیادہ دیانت سے کام نہیں لیا جسکی وجہ سے وہ طریقہ اختیار کرنا پڑا جو اس وقت رائج ہے یعنی جوں ہی مال سرزمین ہندوستان پر آتا جاتا تھا اس پر محصول اُلکا جاتا لگا لیا جاتا تھا۔ ہم ایک دوسرے موقع پر اس خط و کتابت کی نقل کریں گے جو ایٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اور گورنمنٹ مغلیہ کے سورت کے گورنر کے مابین ٹیکس کے معاملہ میں ہوئی ہے اسی سلسلہ میں ہم یہ بھی کہلائیں گے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں گورنمنٹ نے تاجار کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری اس قدر اپنے ذمہ لے لی تھی کہ اگر اُن کا مال چوری جاتا تو گورنمنٹ خزانہ شاہی نقصان کی تلافی کر دیتی تھی

اس میں شک نہیں کہ اوزنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت کا متعادل
یورپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی درآمد
و برآمد کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف شہر سورت میں چنگی کی آمد فی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ
ہوتی تھی اور احمد آباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمد فی تھی۔
ملاحظہ ہو (جلد اول صفحہ ۱۴۸)

بنگال میں صرف دریائے ہو گلی سے (۵۰ یا ۶۰) جہاز مال سے بھرے ہوئے
سالانہ تجارت کے لئے بیرون ہندوستان بھیجے جاتے تھے ایک ایک ہزار میل کے
فاصلہ سے یہ مال کشتیوں پر لایا جاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر افیون، چم، سوٹھ
تباکو اور کپڑا ہوتا تھا۔ (جلد دوم صفحہ ۲۱)

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ تمام ساحل ہند پر ہندوستانیوں کے بڑے
بڑے جہاز تجارتی مال سے لدے ہوئے اچلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۴۵)

آج وہ ہمارے تجارتی جہاز کہاں چلے گئے۔ آج جب کونسل میں بیچو بڑی
کیجاتی ہے کہ ہندوستانیوں کو جہازی بیڑہ تیار کرنے کی اجازت ہو اور یہ کہ ان کو
جہاز رانی سکھانا چاہیے تو دبی زبان میں ان کو ناقابل کہا جاتا ہے لیکن انصاف سے
ہماری گزشتہ تواریخ پر نظر نہیں ڈالی جاتی ہم صرف بھولا ہوا سبق یاد کرنا چاہتے
ہیں اگر ہم سبق بھولنے کے وجوہ بیان کرنے بیٹھیں گے تو یہ کام بہت بوجہ و
مال انگیز ہو گا۔

یہاں تک تو اوزنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت اور متول کا بیان

کیا گیا ہے اب اہل ہند کی فراغ البالی کا حال سنئے اگر شاید مایحتاج کی ارزانی و لوگوں کی خوش حالی و فراغ البالی کسی حکومت کی کامیابی کا ثبوت قرار دیا جاتی ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستانی رعایا بہت فراغ البالی و خوشحال تھی۔

کیتان بھٹن صاحب لکھتے ہیں کہ بیف (گائے کا گوشت) تین فارنگ یعنی کچھ کوڑیوں کو نصف سیر ملتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۱۶۱)

ایک ٹن یعنی کئی من نکس ایک کراؤن میں فروخت ہوتا تھا جو کہ غالباً دو یا ڈھائی روپیہ کے برابر ہوتا تھا

(جلد اول صفحہ ۲۵۵)

ساحل کارو منڈل کے کنارے سارے تین آنے میں ۲۰ پونڈ پھلی جو کہ واقعہ میں ٹراؤٹ اور سامن کے برابر ہوتی تھی ملتی تھی۔

(جلد اول صفحہ ۳۷۹)

شہر کنگ میں مکھن ایک آنے میں ایک پونڈ یعنی نصف سیر ملا کرتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۹۲)

دو آنے میں ایک دو پھلیاں فروخت ہوتی ہیں کہ اتنی اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ ان میں کی صرف دو پھلیاں ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں شہر دہلی کے میں شاید مایحتاج اس کثرت سے اور اس قدر رازاں دستیاب ہوتی کہ اس وقت اس کا یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور ملک بھر آباد تھا

(جلد دوم صفحہ ۲۳)

میں نے ایک ایسے قابل عبادت شخص سے سنا ہے جس نے کہ سو سو روپے میں وہاں زندگی بسر کی ہے کہ پانچ سو اسی (۵۰۰) پونڈ چاول ایک روپیہ میں ملتا ہے۔

(جلد دوم صفحہ ۲۵)

نہن، بارہ ننگے، مور، اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ لوگوں کو گھروں بلا خوف و خطر آجاتے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۴)

احمد آباد۔ دولت، ثروت اور عظمت میں یورپ کے بڑے بڑے شہروں سے کچھ ہی کم ہوگا۔ صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو (۱۶۲۵۰) پاؤنڈ ہے اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دس گنی ہے۔ پاکستان، بلوچستان، سندھ اور گجرات کی باتہ اپنی عینی شہادت دیتے ہیں کہ مہد میں یہ ترقی و ثروت تھی۔

(جلد اول صفحہ ۲۶۶)

کیا آج تمام یورپ کے بڑے بڑے مدبر اس میں متفق الگ نہیں ہیں کہ ہر گورنمنٹ کی کامیابی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جو خدا کے بندے اس کے زیر حکومت ہوں وہ ننگے اور بھوکے نہ رہیں اس کی زیر حکومت ہر شخص کو اگر پیٹ بھر کھانا پہننے کو کپڑا اور رُحیمانے کو مکان مل جائے تو گورنمنٹ کی اصلی غرض حاصل ہو جاتی ہے۔ آج اگر تہذیب و تمدن کی صرف سطح ظاہر پر نظر ڈالی جائے تو وہ کچھ ایسا عظیم انسان اور درخشاں نظر آئیگا کہ دیکھنے والے کی نظر خیرگی کریگی اور ایسا دل فریب خوبصورت دکھائی دیگا کہ دل لہلوٹ ہو جائے گا۔ مگر جب یہ نظر تحقیق اس کی تہ کو دیکھا جائے تو یہ پتہ ملیگا کہ ہر یورپ میں سلطنت اپنی رعایا کی صرف خورد و نوش کے انتظام میں منہمک ہے۔ ولایت میں لیبر گورنمنٹ اس کے

شکار اس کثرت سے یا یا یا تاکہ جو کسی اور ولایت کے لیے بڑے بڑے رونا دھونے کا باعث بنے۔

کو حل کر رہی ہے۔ مجھ کو تو سال ۱۹۲۲ء کے یورپ کے سفر میں محسوس ہوا کہ اُس وقت یورپ کے باشندے روپیہ پیدا کر نیکی دہن میں ہیں نہ حق و ناحق کی پروا ہے نہ واجب و نا واجب کا کچھ لحاظ، خصوصاً وہ جب کسی اجنبی سے معاملہ کرتے ہیں۔ خیر سفر میں میری یہ نظر تو سرسری تھی مگر کئی سالوں کا سفر نامہ پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کے باشندے اپنی زیت کے اسباب فراہم کرنے میں اس قدر حیران و پریشان نہ تھے جیسا کہ آج نظر آ رہے ہیں بلکہ دنیا کے اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ان کی تجارت، دولت ثروت اور فراغ البالی یورپ کے ممالک سے اُس زمانہ میں اگر بڑی چڑی نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ موجودہ افلاس کو عہد اورنگ زیب کی خوشحالی سے مقابلہ کیجئے اور پھر لوگوں کی فراغ البالی کا فیصلہ کرنے۔

رَبَابِ پَنجَم

انصاف وامن واما

ہر حکومت کا دار و مدار انصاف پر ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے مادی برحق رسول خدا کا آب زر سے لکھنے کے قابل یہ ارشاد ہے کہ انصاف و کفر کے ساتھ سلطنت کی بقا ممکن ہے مگر ظلم و اسلام کے ساتھ وہ ہرگز باقی نہ رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اسلامی سلطنت اپنی رعایا کے ساتھ عام اس سے کہ وہ مسلمان یا غیر مسلمان کوئی ہو یکساں انصاف کرنا بقائے سلطنت کا موجب سمجھتی آئی ہے اور شریعہ اسلام قضا کو حکم

کہ باسلم و عیلم ہی وہ فیضیہ کریں جو مقتضائے نصفت و عدالت ہو۔ انصاف وہ
 مقدس عمل علیہ عبادت ہے کہ جس کی بجا آوری میں ذات پات اور مذہب کو
 کچھ دخل نہ ہونا چاہئے۔ انصاف صرف سلاطین اور قضاۃ ہی کا فرض نہیں ہے
 بلکہ ہر شخص پر واجب ہے کہ ایک دوسرے سے انصاف کرے اور انصاف چاہے اور
 جب تک انصاف نہ ہو انسانوں کا ایک ساتھ مل جل کر رہنا غیر ممکن ہے انصاف
 ہر سوسائٹی کی جان ہے۔ اگر کسی تمدن میں انسانوں کے دل سے ایک دوسرے
 کے حقوق کی پاسداری و حفاظت کا خیال نکال ڈالا جاوے تو وہ تمدن ایک
 دم سے درہم برہم ہو جائے گا یوں تو انصاف رواداری اور حسن سلوک کی ملک
 اور قوم کو ضرورت ہے لیکن ہر تمدن میں انسانوں کے باہمی حقوق کا خیال و تصور
 مقامی عادات و رسم و رواج کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ انصاف
 کا تصور بھی مختلف ہوتا ہے اور جب ہر قوم کے خیال کے مطابق انصاف ہوتا ہے
 تو وہ اسکو انصاف سمجھتے ہیں ورنہ ظلم۔ چاہے عال نے اپنی سمجھ میں کیسا ہی وجہ
 اور درست عمل کیا ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ دو ہزار برس قبل ہندو زمانہ کا ایک خاص
 نوع کا تمدن تھا اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اہل ہند کی خاص ضرورتیں
 اسوقت کے خیالات کے تعلق سے تھیں انھوں نے پشیوں کی تقسیم کردی تھی اور
 شادی و غمی و معاشرت حتیٰ کہ خور و نوش کے معاملہ میں ذات برادری کی تہی
 دیواروں کے انسانوں کی تقسیم مختلف طبقات میں اسطرح کردی تھی کہ اگر ہندو زمانہ
 کے کسی منصف سے یہ کہا جاتا کہ کمالات کے فیصل کرنے میں اس خاص تمدن کا تصور
 ذہن سے مثلاً ایسے امر میں نکال ڈالے کہ اگر کوئی ناثر یا چھوت والے شہور نے

کسی برہمن کو چھو لیا ہے تو وہ کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا تو غالباً وہ منصفِ انصاف کے اس تصور پر تسخّر کی نگاہ سے دیکھے گا یہ ہندوؤں کی کیفیت اُن کے ابتدائی تمدن میں تھی اس کے بعد جب مسلمانوں کا تمدن آیا اس نئے ہند کے تمدن میں کچھ نئے عنصر داخل کئے جنہی وجہ سے انسانوں کے خیالات اور ضرورتیں بدل گئیں اور ہند کے باشندوں میں وہ غلط ملط شروع ہو گیا جو کہ تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نئے تمدن نے انصاف کے تصور کو بھی بدل دیا لہذا جب ہم کسی ملک کے انصافِ رسانی کے طریقوں پر واجبیت یا نا واجبیت کا فتوے دینا بھیجیں انصاف یہی ہے کہ ہم اُس زمانہ کے تمدن و ضرورتوں کو پیش نظر رکھیں اُس لئے جو انصاف عہد اور رنگِ زیب میں تھا اس کے متعلق فتویٰ دیتے وقت ہم کو بھی اصولِ مش نظر رکھنا چاہئے۔ یعنی وہ تمدن کونسا تھا اور اُس زمانہ کی ضرورتیں کیا تھیں۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں گوکہ ڈاک کا انتظام اس حد تک کروایا گیا تھا کہ ہندوستان کے دُور دُور مقام سے دہلی تک خطوط پہنچنے میں صرف آٹھ یوم ضرر ہوتے تھے۔ اور پانچ میل کے فاصلہ پر ہر کارے بدلے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۹)

پھر بھی ریل نہ تھی، تاہم اس حالت میں یہ تھیں جیسی کہ آج ہر انسان اُس حد تک غلط ملط نہیں ہوئے تھے جیسے کہ آج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کپتان ملٹن نے اکثر مقامات پر جو تصویر اُن سرائوں کی کھینچی ہے جو کہ قاتلوں یا

ڈاکوؤں کو بھی جاتی تھیں وہ آج ہم کو مصیبت ناک معلوم ہو رہی ہیں مگر امن و امان کے حالات اور ضرورتوں کے لحاظ سے وہ کچھ بھی ناواقف نہیں ہیں۔ کپتان ملٹن نے اُس زمانہ کی عدالتوں کا پورا دستور العمل یا تنظیم ہم کو نہیں بتلائی۔ البتہ سورت کے قاضی کی بات یہ لکھا ہے کہ وہ راشی تھا اور اکثر آزادگری میں (ص) فیصد اناحصہ لیتا تھا اور امیر و دولتمند غریب کے مقابلہ میں اکثر بازی لے جاتے تھے ممکن ہے کہ سورت کے قاضی کی یہی حالت ہو جس سے آج بھی دنیا خالی نہیں ہے مگر ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے انصاف کی کیا حالت تھی انصاف سانی کا پورا انتظام تھا یا نہ تھا۔ اس کا بہترین معیار یہ ہوگا کہ ملک کی اندرونی حالت پر نظر ڈالی جا۔ کیا وہ نشانات و اثرات بخوبی نمودار تھے جو انصاف سے عموماً پیدا ہو کرتے ہیں۔ کیا اہل ہند دنیا کے کاروبار کو باطمینان تمام چلاتے تھے اگر مذہبی رواداری اس قسم کی تھی جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر ملک میں تجارت و متول و فرائع البالی و صنعت و حرفت ویسی ہی پائی جاتی تھی جسا بیان ہوا تو پھر یہ کہنا دشوار ہے کہ عہد اورنگ زیب میں انصاف نہ تھا۔ یہ ثمرات اور نتائج بلا امن و امان و عدل انصاف کبھی کسی ملک کو میسر نہیں ہوتے ہیں عہد اورنگ زیب کی یہ جو کچھ حالت لکھی گئی ہے یقیناً اس عہد کے امن و امان اور عدل انصاف کے ہی بدولت تھی۔ کیا ایک درخت میں سیب کا پھل لگا ہوا دیکھ کر پھر بھی یہ کہنا کہ یہ درخت سیب کا نہیں ہے انصاف ہوگا؟

کپتان ملٹن نے اپنے سفر نامے کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں انصاف کا چشمہ سکون کے ساتھ جاری ہے اور گوکہ اس چشمہ کے صاف و شفاف

دھارے کو بعض اوقات رشوت کے خس و خاشاک مکر اور گد لا کر دیتے ہیں مگر اُس عہد کی مجموعی حالت انصاف کا فیصلہ اس نقاد سیاح نے پر مبنی فقرے سے کیا ہے۔

”لیکن یاہ فام ہندوستانیوں میں رشوت سانی اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی کہ“

گورے چمڑے والوں میں ہے“ (جلد اول صفحہ ۱۸ دیباچہ)

اس موقع پر گورے چمڑے والوں کی رشوت سانی و مطالبہ کے کچھ حالات بیان کئے بغیر شاید عہدِ اونگ زیب کے زمانہ کی قدر اور اُس عہد کے انصاف کا پورا اندازہ ناظرین کو نہ ہو سکے۔ لہذا اکتیان مملکت کے سفر نامے سے چند اقتباس کر رہے ہیں۔

ایک شخص سٹروڈن *Strodon* نامی ایٹ انڈیا کمپنی کے معاملات طے کرنے کے لئے انگلستان سے ہندوستان بھیجا گیا تھا اس کے چال چلن کے متعلق اکتیان مملکت صاحب لکھتے ہیں:-

”اُس کا زمانہ گورنری بہت مختصر رہا۔ لیکن اُس میں بھی اس نے لوگوں کو ٹانگ کر کے اپنا خزانہ بھرنے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ اُس کے مظالم کی ایک خاص مثال یہ ہے کہ“

ایک غریب بلای کی ایک خوبصورت بیوی تھی جو اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں کبھی کبھی کچھ بدعنوانیاں بھی کر گذرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس عورت نے دو آئینوں کو اپنے یہاں بلایا۔ اُن میں اس عورت کے تعلق رقبہ ہو گئی۔ شدہ شدہ ”اِسکی خبر گورنر کے کان تک پہنچی۔ اس نے پہلے تو ان دونوں کو طلب کر کے کچھ“

”سرنش کی لیکن جب اُنہیں ت ایک نے گورنر کے ہاتھ میں پانچ سو روپیہ رکھئے
 تو اُس کو بلا شرکت غیر سے اس عورت کا مالک بنا دیا اور وہ اس کو لیکر موگلی
 چل دیا۔ یہ شخص علانیہ کہتا پھرتا تھا کہ اس سو د میں اسکو کیا خراج لڑا پڑا اور وہ
 اُس گورنر کا بڑا مداح تھا۔ جب اس عورت کا بے چارہ شوہر واپس آیا تو اس کو بیوی
 کی نرسٹ پر مجبوراً صبر کرنا پڑا بایں ہمہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا اس گورنر کو نرسٹ
 لینے میں کچھ شرم و انگ نہ تھی یا اندیشہ نفع ہوتا تھا اُس نے یہ طریقہ اختیار
 کیا تھا کہ جو لوگ اس قسم کے معاملہ کے واسطے اُس کے پاس آیا کرتے تھے اُن سے
 کہہ دیا کرتا تھا کہ میم صاحب اور بابا لوگ سے بات کرو اور اسکی بیوی اور اسکی لڑکی
 نہایت عمدگی کے ساتھ بڑی بڑی رقبےں ٹہری لیتی تھیں اور روپیہ انہیں کے ہاتھوں
 سے پہنچتا۔ میں یہاں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات پر اس قسم کی جبرِ بیوثی
 کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں مگر پُرانے زخموں کی پوسٹ کسی نہیں چاٹتا“

(جلد دوم صفحہ ۱۰)

یہ عہدہ داران ایٹ انڈیا کمپنی کے انصاف کا عالم تھا۔ یہ مشے از خروار کہ
 اُس قسم کے بہت سے واقعات کپتان ہلٹن نے اپنے سفر نامہ میں لکھے ہیں۔ اب
 اوزنگ ریک کا جو انتظام امرِ امان و انصاف کے متعلق تھا اس کی بابۃ کپتان
 ہلٹن صاحب کی رائے کو ملاحظہ فرمائے وہ لکھتے ہیں کہ:-

”اُس ملک کی رعایا فرانس کی اس قدر پابندی کرتی ہے کہ ڈاکہ قتل کی خبریں بہت کم
 سنی جاتی ہیں۔ ایک غیر ملک کا باشندہ اس ملک میں کہیں چلا جاؤ۔ کوئی یہ نہیں
 پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ اور کیوں جاتا ہے“ (جلد اول صفحہ ۲۷۹)

پھر بھی کہا جاتا ہے کہ فرامین شاہی کی کوئی پرواہ نہ کرتا تھا اس امن وامان کا مقابلہ اس بد امنی و ظلم و ستم سے کیجئے جو کہ ایٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں نے ہندوستان کے اس خطہ زمین پر پہلارکھی تھی جس کو بغرض تجارت شاہان غلیب نے اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ جس کا مفصل بیان باب نہم (۹) میں کیا جائے گا۔

مشرعے۔ آر۔ رائے صاحب لکھتے ہیں کہ سمندر پر قزاقوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اسکی ذمہ داری عہد غلیب کے انتظام برعائد کیجائے دزایہ تو دیکھ لیا جاتا کہ یہ قزاق کون تھے۔ اور کیونکر ان کو قزاقی کا موقع ملتا تھا حقیقت یہ ہے کہ قزاق مخصوص ہندوستان کے ساحل کے نہ تھے بلکہ اسی زمانہ میں ولایت سے لیکر ہندوستان تک و نیز دیگر مقامات کے سمندر پر چند لوگوں نے غارت گری کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا انہیں کو ”پانی ریٹس“ (Pirates) کہتے تھے۔ کپتان ملٹن نے ان کا ذکر بھی اپنے سفر نامہ میں کیا ہے اسی ایٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں کے افسر بھی بعض اوقات راہ میں قزاق بن جایا کرتے تھے۔ اور جو کوئی تجارتی مال راستہ میں مل جاتا لوٹ لیتے تھے۔

(جلداول صفحہ ۲۳۶)

ایک انگریز رسمی کپتان گرین "Captain Green" یہ ڈونگ مارا کرتا تھا کہ جب قدر مختصر سامان لیکر وہ انگلستان سے روانہ ہوا تھا اس بے سروسامانی سے یہاں آنے کی شاید کسی شخص کی بھی ہمت نہ ہوتی ہوگی وہ بحری قزاقوں سے تجارت کیا کرتا تھا اور رات میں جو جہاز اسکو مل جاتا تھا اس کو لوٹ کر وہیں ڈوبا بھی دیتا تھا۔ اور اسی طرح سے اپنی بسر اوقات کرتا تھا۔ (جلداول صفحہ ۳۱۷-۳۱۸)

میں نے تجارت کے باب چہارم کے سلسلہ میں دیکھا یا ہے کہ اُس وقت اہل ہند یورپ تک تجارت کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ قزاق بعض وقت راستے میں ہونگے ہوئے ہو کر جہاز لوٹ لیتے ہوں جیسا کہ تھلٹن کے سفرنامہ کی جلد اول صفحہ ۲۱۵ سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ اورنگ زیب اس غارتگری کے انداد کا انتظام نہیں کرتا تھا۔ اولیٰ کا انداد اُس زمانہ کے حالات کے نظر سے صرف ہند کے سمندر پر انتظام سے نامکن تھا۔ پھر بھی بادشاہ کے فوجی جہازوں کا بیڑہ ڈنڈارا جا پور میں بیٹھا تھا۔ اس کا کمانڈریدی خاں تھا جس کے قبضہ میں (۳۰) یا (۴۰) ہزار آدمیوں کی فوج کا دستہ رہتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۰)

اس لئے یہ کہنا کہ سلطنت ہند کی طرف سے انداد قزاقی میں بے پروائی کیجاتی تھی انصاف نہ ہوگا۔ رہی کامیابی و ناکامیابی وہ کہاننگ بھی اس کا فیصلہ نہیں زمانہ کے حالات کی نظر سے کرنا چاہئے خصوصاً جب کہ انداد قزاقی کی غرض سے اُس کمانڈر کے پاس توپیں بھی تھیں ایک مرتبہ جب ضرورت پڑ گئی تو اسی کمانڈر نے آناٹانائیس چارٹری توپیں کر ڈر گیری کی اس عبارت پر چڑھا دیں تھیں کہ بمبئی کے قلعہ سے صرف ۲۰۰ قدم کے فاصلہ پر بھی الغرض عایا کی پوری طرح سے حفاظت کیجاتی تھی۔ کپتان جہانپور پش پش کی ریاحت میں صرف ایک موقع کا ذکر اپنے سفرنامہ میں یہ لکھا ہے کہ اسٹین سزین ہند پر ڈاکوؤں کا مقابلہ ہو گیا تھا ایک قافلہ کے ساتھ شہر سورت کی طرف کپتان صاحب صوفیادہ اُن کے ہمراہی و ملازمین جارہے تھے کہ چند قزاقوں کے گروہ نے جو کہ سرحد ہند پر

کے باہر بلوچستان سے عموماً آیا کرتے تھے قافلہ کو روکنا چاہا۔ کپتان صاحب اور
 اُن کے ملازمین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے اُن کو بھگا دیا۔ قافلہ راس شجاع
 کا بڑا اثر ہوا۔ یہ خبر اڑنی اڑتی شہر سورت میں پہنچی کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب
 اُن کا قافلہ سورت کے قریب پہنچا تو اہالیان شہر نے مٹھائیوں اور تحفوں کے
 ساتھ اُن کا استقبال کیا اور جب کپتان جہانے گورنر سورت سے ملاقات کرینیکی
 خواہش کی تو اس نے چند گھوڑے زیور سے آراستہ ویراتہ اور ایک باڈی گاڑ
 استقبال کے لئے روانہ کیا اور جب وہ قریب آئے تو انہی یہ آؤ بھگت کی کڑی
 معمول دستور کپتان صاحب کی سواری کو اپنے خیمے تک پہنچی اجازت دی گئی
 تمام مال و اسباب کا محصول معاف کر دیا اور بغیر نقص خود فوج کا ایک تہ لکیر
 اُن فرائق کو سرانجام دینے کے لئے روانہ ہوا۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۹)

اس قدر خاطر و مدارات کی غالباً یہ وجہ تھی کہ بقول کپتان صاحب بادشاہ
 اورنگ زیب کو حفظ امن کا بیحد خیال تھا اور جب کبھی کسی مقام راس قسم کے واقعہ
 ہوتے تھے تو اُن کی تمام ذمہ داری صوبہ کے گورنر کے سر ہوتی تھی ایک مرتبہ جب
 اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی کہ سورت میں ڈاکہ پڑا تو بادشاہ کا حکم بدین مضمون
 شرف سے دہرایا کہ فوراً شہر کے گرد چار دیواری بنادی جائے۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۵)

ایسے واقعات کا یہاں کبھی کبھی مشانا تعجب خیز نہ تھا اور کرنل نے میں اور
 کس بات میں ایسے واقعات نہیں پیش آتے رہتے ہیں در یہ زمانہ کپتان نے خالی

دیکھنا یہ چاہئے کہ اُس زمانہ میں ملک میں امن و امان کی حالت یہ تھی کہ یہی ساج
 تاج مال و اسباب لیکر سترہ (۱۷) کھاروں کی پالکی میں سوار ساحل وسط ہند
 میں برسوں پھرتا رہا مگر سوائے ان دو واقعات کے ہندوستان میں کوئی اور
 ایسا واقعہ اس کو پیش نہیں آیا جس کو وہ اپنے سفر نامہ میں درج کرنا ملک کی اس اندرونی
 حالت سے عہد اور نگ زیب میں انصاف و امن و امان کے متعلق قائم کیا کہ
 میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ عہد اور نگ زیب میں تمام عہدہ داروں کا دامن رشوت تھی
 کے دھبوں سے پاک و صاف تھا یا کہ یہی ڈاکہ نہیں اڑتا تھا انصاف کے معاملہ میں
 جب کہ یہی دولت و غربت کا مقابلہ ہو جاتا ہے تو یہ حضرت زمر مختلف صورتوں میں آج
 بھی بڑے بڑے کشتے دکھلاتے ہیں جو لوگ کہ موجودہ مقدمہ بازیوں کی اندرونی
 حالت سے واقف ہیں وہی اسکا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی روپیہ
 جھوٹی شہادت کے ہیا کرنے میں اور قانون کی امداد حاصل کرنے میں ایک ولسند
 فریق کو کہاں تک مدد و کرم قوی بنادیتا ہے اور غرض بق مخالف کو کسی کچھ لاچاری
 اور مجبوری کا سامنا ہوتا ہے اور اس طرح سے یہ حضرت زمر آئے دن کیا کچھ انصاف
 کا خون نہیں کرتے رہتے ہیں۔ رشوت ستانی و ڈاکہ اور چوری اب بھی بند نہیں ہے
 ہمارے بچوں کو جو بائیس مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہیں انہیں ٹھکی کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے
 اور کہا جاتا ہے کہ ٹھکی کا انڈیا ایسٹ انڈیا کمپنی کی عہد حکومت میں انیسویں
 صدی میں کیا گیا تھا اور اس کا فخر کمپنی مذکور کو دیا جاتا ہے مگر ان تاریخوں میں
 ملک کے اُس امن و امان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا جو کہ قبل کمپنی کی حکومت کے تھا
 اور جس کا تذکرہ کیا ان ہلٹن نے اپنے سفر نامہ میں کیا ہے اصلیت یہ کہ اُس

ملک میں ٹھہلی اس وقت آئی جب کہ حکومت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا جب اس ملک کے باشندوں نے اپنے انگریز حکمرانوں سے یہ کہا کہ عہدِ حکومت پھر ان کے ہاتھ میں دیکھا جائے تو بڑی کشمکش کے بعد ان کو "ڈائی آرکی" (Diarchy) دی گئی جس کے بموجب ملکی انتظام کا ایک جزو انتخاب شدہ منسٹر یا وزیر کے سپرد ہوا اور دوسرا جزو گورنمنٹ کے سپرد رہا۔ اس طرح سے حکومت کی تقسیم ہوئی اس تقسیم کے دو ہی برت میں چل پکا جگ گئی دونوں حصوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ اور ہی برت میں بد امنی و بے اطمینانی کے آثار نمودار ہو گئے۔ "ڈائی آرکی" نام کا م ثابت ہوئی اور نہ دوستانہ شخص کہنے لگا کہ "ڈائی آرکی" حکومت کرنے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اب اس "ڈائی آرکی" پر غور کیجئے جب ہندوستان کی حکومت شاہ مغلیہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد داروں میں تقسیم ہوئی تھی ملک کی اس وقت کیا حالت ہو گی جبکہ حکومت کا شعبہ دیوانی کمپنی کے عہدہ داروں کے قبضہ میں آ گیا اور دوسرا شعبہ مالگزار شاہ مغلیہ کے سپرد رہا ایسے دو متضاد عنصر کا جمع رہنا محال تھا۔ پھر بھی سارا ملک انداز نصف صدی اس عجیب و غریب "ڈائی آرکی" Diarchy کے تہلکے میں گرفتار رہا۔ ان حالات میں دشمنی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جو کچھ نہ ہوتا ٹھوڑا تھا۔ لیکن جب عہدِ حکومت کلیتاً اس ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی تب ایسی بد امنی یا ٹھہلی نہ تھی اس وقت انصاف تھا اور امن و امان تھا۔

چشتِ قانونِ پیشہ اودہ کے بہت سے دیہات و علاقہ جات کی واجب العرض پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا جن میں گاؤں یا علاقہ کی گذشتہ تاریخ ہی بندوبست اول میں درج کی جاتی تھی۔ مجھ کو اکثر یہ دیکھ کر استعجاب ہوا کہ ایک گاؤں یا علاقہ

شہادت تک ایک ہی خاندان کی ملکیت و قبضہ میں برقرار رہا یہ بھی دیکھئے ہیں کیا کہ جس شخص نے تین سو یا چار سو برس قبل جنگل کا ٹکڑا آباد کیا تھا اسی اولاد کے قبضہ میں وہ گاؤں ششماع کے غدر میں بھی پایا گیا۔ اگر گزشتہ زمانہ میں انصاف و امن و آمان نہ تھا تو کسی گاؤں کی مسلسل تیاج اس طرح سے کبھی نہ ہوتی ان وجود سے جیسے موجودہ زمانہ کی باتہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مجموعی حیثیت سے انصاف نہیں ہے یا امن و آمان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کی بابت یہ کہنا کہ انصاف نہ تھا یا امن و آمان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی انصاف نہ ہو گا۔ یہ عہد اورنگ زیب کے انصاف و امن و آمان کے تیاج تھے جو کہ ملک کی تجارت و معمول و فروع البانی کے سلسلہ بنان میں نظر آئے ہیں۔

باب ششم

صنعت و حرفت

تیاج امن کی شاہد ہے کہ جب کسی ملک میں انصاف ہوتا ہے تو امن و آمان ہوتا ہے اور جب لوگ فروع البال و خوشحال ہوتے ہیں اور جب تلاش و معاش سے کس قدر بے فکری ہوتی ہے تب ہی انسانی فروع و صنعت و حرفت کی جانب رجوع ہوتا ہے مطلقاً مومن و دنیا دونوں میں رویا ہوتی ہے۔

”الْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْهِ فِي الدَّارِ“ میں کوئی شک نہیں ہے

”پراگندہ روزی پراگندہ دل“ کی مثل ایک متنفسِ رضادق آتی ہے اسی طرح سے قوم پر بھی صادق آتی ہے اب اب دیکھئے کہ عہدِ اورنگ زیب میں ہندوستان کی صنعت و حرفت کی کیا حالت تھی اس سے اس ملک کی خوشحالی کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

کیمان صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں عہدہ سے عہدہ کپڑا اور کثرت ایسا ملتا تھا جسکی مثال یورپ میں ملنی دشوار تھی پھر فرماتے ہیں کہ یہاں روئی کا ایک ایسا کپڑا بنا جاتا ہے جو بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے اور اسقدر پائدا کہ ویسا انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں استعمال نہیں کیا۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۵)

غالباً یہ دھاکہ کی مشہور ملم ہوگی۔ اس کے علاوہ کھواب، چھینٹ اور ساد اکڑے بنانے والے اس کثرت سے پائے جاتے تھے کہ صرف ایک شہر جیسا بورسٹا ٹیڈا کمپنی نے (۵۰۰۰۰) پچاس ہزار کپڑا بننے والے جلابے ملازم رکھ کر چھوڑے تھے لوگ پوچھیں گے کہ پھر صنعت کہاں غائب ہو گئی۔

جن لوگوں کو اسکی جستجو ہو وہ ریش حبسِ دردت آئی۔ سی۔ سی۔ ایس۔ سی۔ آئی۔ اے۔ ای۔ مروجہ کی کتاب ”ہند کی ایک انیمک ہسٹری“ ملاحظہ فرمائیں۔ فی الحال فخر ہندوستانی ایک زمانہ میں اڑیہ میں بہ عہدہ کثرت متنازع تھے اور پھر لندن کی یونیورسٹی کالج میں تانچ مندر پر لکچرار مقرر ہوئے۔ انہوں نے ان سرکاری کاغذات کی مدد سے جو انکی نظر سے گزرے تھے یہ دکھایا ہے کہ انگلستان کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے اور اس خوف سے کہ شاید ہندوستان کا کپڑا انگلستان کی منڈیوں میں

قبضہ نہ کر ليوے ایٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ دار ہندوستان کے مذاق دار اس کی
صفت کو نیت نابود کرنے کی غرض سے مختلف اقسام کی تدابیر استعمال کرتے تھے
پہلے کچھ رقم شکی دیکر ان کو ملازم رکھ لیتے تھے اور جو چاہتے تھے وہ کام سے
لیتے تھے اگر کسی نے کچھ بھی خلاف معاہدہ کیا تو کمپنی میں باندھ کر بیروں سے سزا
دیتے اور اس کی انگلیوں کو مختلف اقسام کی ایذا پہنچاتے تھے۔ ۱۸۶۹ء مارچ میں
کو ایٹ انڈیا کمپنی نے جو عام دہائیں اپنے عہدہ داروں کے لئے جاری کی ہیں
ان کا پڑھنا بھی تکلیف دہ ہے۔ ہاؤس آف کامنس سٹی کے روبرو ۱۸۶۳ء میں جو
شہادت تھامس منرو نے دی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمپنی کے عہدہ داران
مذاہف کو بھٹیروں کی طرح سے ایک مقام پر جمع کر کے کھڑا کرتے تھے اور ان پر
پھر مقرر کر دیا جاتا تھا کہ جب تک وہ مذاق حسبِ لخواہ کمپنی معاہدہ پر دستخط نہ کریں
اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پاویں۔ میٹر کا کس نے شہادت دی تھی کہ اس طریقہ سے معاہدہ
کے پابند جولاہوں کی تعداد صرف اُس کے ایک کارخانہ میں سترہ سو (۱۷۰۰) ہے
کمپنی نے جو قانون ۱۸۶۳ء میں نافذ کیا تھا اور جو ریکولیشن ایکٹس ۱۸۶۳ء کے نام سے
موسوم ہے اس کو ملاحظہ کیجئے۔ اس قانون کے بموجب جن پارچہ باف نے کمپنی سے شکی
رقم لے لی ہے اس کو یہ حق نہ تھا کہ کسی دوسرے کام بنا دے اور اگر کوئی پارچہ باف
ایک سے زیادہ کا گاہ اپنے گھر میں کہے گا تو بڑا تاراواں دینا پڑے گا۔ فوجداری میں
مقدمہ چلایا جاوے گا۔ عہدہ داران کمپنی کو ان کے مکانوں میں خلا مضی داخل
ہو جانے کا بھی اختیار دیدیا گیا تھا۔ ان کارروائیوں کا نتیجہ ہوا کہ جب ۱۸۶۳ء میں
صرف (۱۵۶) پونڈ کا مالیتی کٹر سالانہ ولایت ہندوستان کو آیا تو سالانہ ۱۸۶۳ء میں

یعنی صرف دس برس کے بعد (۲۷۸۵۶) تائیس ہزار آٹھ سو چھتیس ٹونڈ کا مالیتی کٹر اسالانہ ہندوستان کی تن پوشی کے لئے ولایت سے لایا گیا اور شالانہ میں پچھتیس برس کے بعد ایک لاکھ آٹھ ہزار آٹھ سو چوبیس (۱۰۸۸۲۴) ٹونڈ کا کٹر اسالانہ لایا گیا۔ پھر وہ پارچہ باف یا ان کی صنعت جو عہد اورنگ زیب تھی اب کیسے دکھلائی گئی۔ یہ تمام مواد ریش خیزدوت مرحوم کا جمع کیا ہوا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور علما کپنی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

عہد اورنگ زیب میں اس ملک کی صنعت پارچہ بافی کو اس قدر عروج تھا کہ کم نہ صرف اپنی پوری ضروریات کو ملک ہی کے کپڑے سے پورا کرتے تھے بلکہ غیر مالک کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی دولت میں اضافہ کیا کرتے تھے یہ تو صرف پارچہ بافی کا ذکر ہے عہد اورنگ زیب میں کپتان صاحب ملتان کو بھی گئے تھے تو وہاں ان کو بہترین تیر و کمان بنانے والے ملے۔ لومہ بکثرت پایا حتیٰ کہ جہازوں کے واسطے لوہے کے لنگر بھی ڈالنے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۳۹۲)

کپتان صاحب نے گو لکھنؤ کے میروں کا بھی ذکر کیا ہے قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب کسی ملک کے تمدن کو عروج ہوتا ہے تو اس کا عکس اس ملک کی عمارات و مکانات کی طرح ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ طبوئیات پر عیش و عشرت کے یہی سامان میں جنہاں انسان کی طبیعتی قدانت اکثر نمودار ہوا کرتی ہے فنِ نجیبی کے متعلق تو صرف اس قدر کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اہل ہند اگر وہ دہلی و لاہور کی وہ خوشنما

عمارتیں مکمل کر چکے تھے جن میں ایک عمارت "تاج بی بی" کا روضہ ہے جو اس وقت بھی عجائبات دنیا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے عمارات بنانے والے عہد اورنگ زیب میں موجود تھے اور ان کے دماغوں کی جب تک کہن تک پہنچی تھی۔ دکن میں جہاں اورنگ زیب کا قیام کچھ عرصہ تک رہا ہے اس کے قریب جوار کی عمارتیں ملاحظہ ہوں اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی مٹی کا مقبرہ۔ قلعہ دولت آباد کے نیچے کی وہ مسجد وہ کہنڈر اور وہ منارے ملاحظہ ہوں جہاں اب یورپ کے شکار کے لئے لوگ جاتے اور جن کو دیکھ کر یہ شعر یاد آتا ہے:-

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ

آثار بدست صنایع مجسم را

خود میرے قصبہ ایٹلی میں ایک مقبرہ ہے جس کے گنبد پر کھن میں دُور سے چند مائیل اس معنے کے چلتے ہوئے دیکھا کرتا تھا جیسے کہ اب یورپ سے مسافر آتے ہیں اور جو وہاں کی صنایع کے نمونے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے کہ جسے ہم بہت زمانہ ہوا ایجاد کر کے رائج کر دیا تھا۔

اگر اورنگ زیب کے زمانہ کے فن انجیری کے دوسرے شعبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے تو دکن میں اورنگ آباد کے قدیم وائرورس کو دیکھئے۔ آج تک لوگ حیران ہیں کہ وہ کونسا چشمہ ہے اور وہ کونسی ترکیب ہے جس کے ذریعہ سے تہذیب میں بڑے بڑے نالے بنا کر میٹھے پانی کی گویا ندی بہا دی ہے جس نے اورنگ آباد کی آبادی کو صرف سیراب ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ باخوں، نہروں، حوضوں اور فواروں سے بہشت کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ مجھ سے خود اسٹون برج صاحب جو سلطنت حیدر آباد

کے واٹر ورکس کے انجینر تھے یہ بیان کیا کہ اگر آج ہم اس سے بہتر مانی کالیل نکالنا چاہیں تو مشکل ہے وہ مقرر تھے کہ اورنگ آباد کے لئے اس سے بہتر واٹر ورکس کا انتظام کرنا اس زمانہ میں بھی دشوار ہے۔ اُن کو افسوس تھا کہ فن انجینری جس نے اسے واٹر ورکس بنائے تھے ہندوستان سے اب معدوم ہے۔

..... کیفیت اس خزانہ آب کی یہ ہے کہ ایک مقام پر صرف ایک بہت عمیق کنواں جس میں جھانکنے سے ایک چشمہ کا جھرایا سوتا سا نظر آتا ہے۔ یہیں سے ایک گہرا پختہ نالہ بہنا شروع ہوا ہے۔ جوں جوں شہر کی طرف یہ نالہ بڑھتا گیا ہے اس میں انغاروں پانی نمودار ہوتا جاتا ہے۔ شہر کے قریب جا کر اس میں سے پختہ نالہ نکالی گئی ہیں۔ ڈھائی سو برس کے بعد آج بھی انہیں نالیوں سے شہر کو پانی ملتا ہے لیکن اسکی مرمت و صفائی کرنے میں اس زمانہ کے انجینر بہت دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے محیر العقول واٹر ورکس نہ صرف اورنگ آباد میں تھے بلکہ مرنج اس کے آثار بڑے ویدیر جیسے دور دراز مقامات پر بھی دیکھے ہیں گوکہ وہاں اب وہ اسطرح سے کار آمد نہیں ہیں جیسے کہ اورنگ آباد میں ہیں۔

کپتان مہلٹن صاحب لکھتے ہیں کہ ندھ کا شہر ”ٹٹہ“ دریائے اندس سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ دریائے ندیہ کی نالہ اور مہروں کے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

(جلداول صفحہ ۱۲۱)

کیا یہ تمام واقعات اس کا ثبوت ہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں صنعت و حرفت اور دوسرے فنون پورے عروج پر تھے۔ کہ اسوقت غالباً یورپ کو

ہندوستان سے وہی رشک تھا جو کہ صنعت و حرفت کے مقابلہ میں آج ہندوستان کو یورپ سے ہے۔

۱۹۲۳ء میں دولتِ برطانیہ کی صنعت و حرفت کی بڑی نمائش جو لندن میں ہوئی اسکی ایک نمائندہ صنعت و حرفت کے نمونے بھی دکھائے گئے مجھ سے جب کسی انگریز نے اُن نمونوں کی تعریف کی تو میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اس نمائش کے ہندوستانی سکشن میں وہ کونسی چیز ہے جس کو ہمارا ہندوستان پر قبل نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم کو یہ یاد دلایا کہ صنعت و حرفت کے میدان میں ہندوستانی دماغوں نے گذشتہ صدی میں پہلے سے زیادہ کیا ترقی کی ہے۔

..... لکھنؤ کی حکیم - 'فتح آباد کے پردے' دہلی و اگرہ کا سنگ مرمر کا کام، مراد آباد کے برتن، کشمیر کی شالیں، یہ سب چیزیں جو اسوقت ہم نمائش میں دیکھ رہے ہیں وہ کچھ ان سے بہتر نہیں ہیں جو ہم سابقہ صدیوں میں بنا سکتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں کشمیر میں اُن سے بھی بہتر پرانی شالوں کے نمونے دیکھے ہیں جن کے نوآج ولایت کے اخبارات میں نمائش کی شہرت دینے کی غرض سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

دوسرے مالک مثل کینڈا اور اسٹریلیا وغیرہ کا جو سکشن دولتِ برطانیہ کی نمائش میں ہے اسیں اور ہندوستان کے سکشن میں بڑا فرق ہے کہ ان نوآبادیوں کی اگر نمائش میں کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی جس کو وہ ایسی خوبی اور مقدار میں بے پیماس برقیں قبل بنا سکتے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے سکشن میں کوئی ایسی اگر چیز نہیں معلوم ہوتی جس کو ہندوستانی دماغ نے حال میں کیا ہو اور وہ

سو برس قبل نہ بنا سکتا ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم تو بہت سی صنعتیں بھول گئے یا ہم ان کے بھول جانے پر مجبور کئے گئے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں جو ہلکے ڈھاکہ میزنی تھی آج وہ کہاں ہے؟

وہ فولاد کہاں ہے جو ہندوستان کے نام سے لندن کے بازار میں بکا کر آتا تھا وچھنیٹ کہاں ہے جس کا ذکر کپتان ملہٹن نے کیا ہے۔ وہ زربفت کہاں ہے جس کا خلعت کمپنی کو گورنر سورت نے اورنگ زیب کا فرمان شاہی پڑھتے وقت حسبِ رواج ملک عطا کیا تھا اور جس کا ذکر دوسرے موقع پر کرونگا۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا کسی قوم سے جو فوائد پہنچتے ہیں ان کو نظر انداز کرنا بڑا اخلاقی جرم ہے لہذا ہم آخری باب میں ان فوائد کا اعتراف کریں گے جو موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو پہونچے ہیں لیکن اس موقع پر ہم کو عہد اورنگ زیب کی صنعت و حرفت کا بتلانا منظور ہے اور اس سلسلہ میں مقابلہ کرنا ضروری تھا۔

بعض لوگ شاید یہ خیال کریں کہ ہندوستان میں آج یلیں چل رہی ہیں موٹر دھڑ رہی ہیں۔ جابجا ہوائی جہاز بھی اڑتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ سب عہد اورنگ زیب میں کہاں تھا۔ کاش یہ خبریں ہمارے دماغ کی ترقی کا ثبوت ہیں ہم تو ایسی ذری ذری سی چیزوں کے آج محتاج ہیں جیسے دیاسلائی، بوٹ کا پائٹ ہماری اصلی حالت اب یہ ہے کہ مختلف قسم کے فنون و صنعت و حرفت سیکھنے کے لئے دوسری قوموں کا منہ تک رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ فرانس جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ جرمنی جاؤ۔ وہاں کے لوگ کھانے میں دینے نہیں کرتے۔ کوئی کہتا ہے کہ

شاید جاپان کو ایشیائی ہمدردی ہو، کوئی کہتا ہے کہ یہ روزی کا معاملہ ہے۔
 صنعت و حرفت تم کو کوئی نہیں سکھائیگا تم خود اپنا جھولا ہوا سبق یاد کرو اور
 چرخہ کی الف۔ بے سے پھر شروع کرو۔ انگلستان کے ہم مشکور ہیں کہ چند زبانوں
 کے سکھانے کے واسطے اسنے اپنی بڑی بڑی یونیورسٹی کے دروازے ہی ہمارے
 بچوں کی ایک محدود تعداد کے لئے کھول دئے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ہم یہ
 کہنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہمارے ملک کے طالب علموں کو اسکی خام شکایت ہے
 کہ انگلستان انکو اس صنعت و حرفت کے سکھانے میں پس و پیش کر رہا ہے جس سے
 ملک کی وہ دولت و تمول جو دکرے جو عہد اورنگ زیب میں بانی جاتی تھی
 جب کہ صرف ایک ہندوستانی تاجر کا سرمایہ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل
 سرمایہ تجارت کے برابر تھا جیسا کہ کپتان تھلٹن صاحب کے سفر نامہ سے معلوم
 ہوتا ہے اور جس کا ذکر باب چہارم میں کیا جا چکا ہے۔

بابِ ہفتم

جہان نوازی

کپتان ملٹن کا سفر نامہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ اورنگ زیب میں نوآبادی کا ایشیائی شعاربست کچھ موجود تھا۔ جہاں جہاں انہوں نے سفر کیا ہندوستانیوں کی جہان نوازی نے اس کے دل پر ایک خاص اثر پیدا کیا۔ مثلاً صوبہ بنگال میں کسی رئیس کی سرحد سے جب لکھی یا لکی گزری اس وقت وہ رئیس تو شکار کو نکلے ہوئے تھے مگر مقام شکار ہی سے دعوت کا رقعہ بھی دیا۔ چنانچہ کپتان صاحب لکھتے ہیں:-

”جب میں وہاں پہنچا وہ رئیس صاحب شکار کو نکلے ہوئے تھے۔ مجھ کو سلام کہا بھیجا۔
 ”اور یہ پیغام بھیجا کہ وہ مجھے ملاقات کے متمنی ہیں۔ میں یہ بہانہ کر دیا کہ مجھے
 ”نعرس کی شکایت ہے۔ میرے اس عذر کو انہوں نے بلا مال قبول کر لیا۔ اور
 ”میں نے کہانے کے واسطے چڑیوں کا مرغین نالں بھیجا۔ اور دوسرے روز شہر کے
 ”اکثر مرغزین مجھ سے ملنے آئے اور یہ خواہش کی کہ جب تک وہاں کے رئیس شکار
 ”واپس آئیں میں وہاں قیام کروں۔ لیکن مجھے ضروری کام تھا اس لئے مناسب الفاظ
 ”میں ان کا شکریہ ادا کر کے میں وہاں سے رخصت ہوا۔“

(جلد اول صفحہ ۳۸۷)

منہر بنی تمدن کے لحاظ سے بغیر اس کے کہ کوئی شناسا تعریف یعنی انٹروڈکشن کرے

بات کرنا تک معیوب ہے۔ توقع و مدارات تو درکنار۔ ایک دوسرے مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ کنا نور کی سرحد میں داخل ہوئے تو صرف یہ خیال تھا کہ انوار علی واماں کے رئیس کی بیوی نے جوشا نہرادی تھی اپنے ہاتھ سے پان اور شربت دیا۔
(جلداول صفحہ ۲۹۵)

ایک دوسرے رئیس کو جب کپتان صاحب نے کچھ پکڑا، تھالین، اور دو تفنگ بجے بطور سوغات بھیجے تو وہ اس قدر خوش ہوا کہ اس نے فوراً اپنی کلائی سے ایک زیور جو جواہرات سے مصرع تھا آٹا کر کپتان صاحب کو پہنا دیا اور یہ اجازت دی کہ اس کی ریاست کے حدود میں کپتان صاحب ہر جگہ بے تکلف سفر کر سکتے ہیں۔
(جلداول صفحہ ۳۰۲ و ۳۰۳)

انصاف امن واماں کے باب میں ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ جب کپتان صاحب ایک قافلہ کے ساتھ سورت کے قریب پہنچے تو کس طرح لوگوں نے ان کی خاطر تواضع کی اور جب وہ گورنر سورت سے ملنے گئے تو کس کشادہ پیشانی سے اسے ان کا استقبال کیا اور ان کی دعوت کے لئے ایک گائے پانچ بھیریں، پانچ بکریاں، بیس مرغیاں، پچاس کبوتر اور بہت سی مٹھائی اور پھل بھیجے۔

(جلداول صفحہ ۱۱۸ و ۱۲۰ و ۱۹۰)

کپتان صاحب پھر لکھتے ہیں کہ اہل ہند انگریزوں کی فیکٹری کے افسروں کی بہت عزت کرتے ہیں اور بنا اوقات جب کہیں یہ انگریز تھکا رہے جاتے ہیں تو وہ ان کے معزز ہندوستانی اپنے ملازمین و اسلحہ اور باجے گلاب کے ساتھ ان کے ہمراہ جاتے ہیں۔
(جلداول صفحہ ۲۶۳)

یہ مہان نوازی ایشیائی خلقت میں داخل ہے اور غالباً قدیم زمانہ میں خطہ
عرب دوسرے تمام ایشیائی ممالک سے بھی بقت لیگیا تھا۔
اَلْکَرْمُو اَضِیْقُوْهُ لَوْ کَانَ کَافِرًا وَّ اَجْنَبِیًّا

(اپنے مہمان کا اکرام کرو چاہے وہ کافر ہو یا اجنبی کوئی ہو)
عربوں کا دستور العمل رہا ہے۔ مجھے ایک واقعہ ساحل عرب کا بہت پر
معلوم ہوا جسکا ذکر کپتان صاحب نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔ ساحل عرب کے
کسی مقام پر جہاز میں پانی آنے لگا۔ مجبوراً کپتان صاحب کو لنکر ڈالنا پڑا دیکھا
کہ ریگستان میں کچھ جنگلی عرب خیمے ڈالے پڑے ہوئے ہیں گویا وہ اس جہاز کے
منتظر تھے۔ یہ عرب بدد کی واسطے فوراً پہنچ گئے انہوں نے پہلے یہ طے کرنا چاہا کہ انکو
کیا اجرت ملیگی۔ کام یہ تھا کہ جہاز سے کل مال نکال کر ساحل پر جمع کر دیں تاکہ جہاز
ہلکا ہو جائے اور جہاز کی مرمت کے بعد اباب پہر لاو دیں۔ اور اس اثنا میں
مال کی پوری حفاظت بھی کریں۔ کپتان صاحب اول تو ڈرے کہ یہ لوگ جہاز
کا مال کہیں لوٹ نہ لیں مگر صاحب بہادر لنکر ڈالنے پر مجبور تھے ورنہ جہاز ہی
ڈوبا جا رہا تھا۔ بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ کل مال دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ
اجرت میں دیا جائے یہ طے ہو گیا تو عربوں نے کہا کہ مزدوری کی حد تک تو
معاملہ ختم ہو گیا مگر اب آئندہ سے تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ کپتان صاحب کو
ان جنگلی عربوں کی مہمان نوازی پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایشیائی مہمان نوازی
کی روایات ہیں۔ کپتان صاحب کو اس پر بھی حیرت ہوئی کہ وہ اس ریگستان میں
پہلے سے خیمے ڈالے کیوں پڑے تھے۔ ان سے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ

ان عربوں کے پرنے پشتر سے اسکی اطلاع دیدی تھی کہ فلاں مقام پر ایک جہاں کے مسافر مصیبت میں گرفتار ہونگے تم انکی مدد کرنا اور بد معاہلگی نہ کرنا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے انگریزوں کا اعتقاد جادو پر تھا۔ کپتان صاحب نے اپنے سفر نامہ میں ان عربوں کی پیش بندی جادو پر محول کی ہے خاص منہ و خاصا کے متعلق جو حالات کپتان ملتیں صاحب نے عہد اور رنگ زیب کے لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت اہل ہند بھی مہمان نوازی و مسافر نوازی میں اپنے کسی پڑوسی ایشیائی ملک سے پیچھے نہ تھے یورپ کا موجودہ تمدن جہاں کچھ اچھی باتیں ہم کو سکھاتا ہے وہاں اسکے ساتھ ساتھ ہمارا قدیم تمدن کی بعض اچھی باتیں ہم کو سکھاتا بھی رہا ہے بخدا ان چیزوں کے جو اہل ہند بھولتے جا رہے ہیں مہمان نوازی کی عادات ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ یورپ میں مہمان نوازی نہیں ہے لیکن ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں فرق ہے۔ یورپ میں کہنے اور خاندان کی نسبت تصور۔ افراد خاندان کے باہمی فرائض و رومنہ داریوں کا کھل ذاتی آسائش و عیش و عشرت کو حتی الامکان ترجیح دینا۔ روزانہ کی ضروریات۔ طرز معاشرت۔ مکان میں گروں کی تقسیم۔ ہٹلوں میں رہنے کی عادت۔ زمین کو قلت۔ آباوہی کی کثرت۔ مادی ترقی میں بے حد انہماک۔ روحانیت کی جانب بے توجہی۔ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جنکے اعتبار سے ایشیا و یورپ کے طرز معاشرت و تمدن میں زمین آسمان کا فرق ہے گویا ایشیا اور یورپ ایک دوسرے سے بالکل ہی علیحدہ دو عالم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں جو فرق تھا اور ہے وہ اسی قسم کی معاشرت و فرق کی وجہ سے تھا جنکی طرف

میں نے اشارہ کیا مگر جوں جوں ان باتوں میں فرق کم ہوتا جایگا اُسی مناسبت
 دونوں ملکوں کی عادتوں میں مشابہت ہوتی جائیگی اس سے یہ سمجھنا چاہئے
 کہ اہل یورپ میں انسانی مہر دی کم ہے یا ان میں نیکی کرنے کا مادہ کم ہے خلقِ خدا
 کو آرام پہنچانے اور انکی تکالیف کو کم کرنے کے لئے یورپ میں جو اسی ٹیوشنس
 شفا خانوں اور دیگر مادی جامعوں کی صورت میں آج بکثرت موجود ہیں وہ
 اسکی دلیل ہیں کہ دنیا میں اسوقت اہل یورپ بنی نوع انسان کو مدد دینے میں
 بڑا حصہ لے رہے ہیں اہل یورپ کی تحقیر کرنا ہم ایک اخلاقی جرم سمجھتے ہیں یہی
 مہمان نوازی کے متعلق ہمارے اور اہل یورپ کے تمدن میں ہمیشہ فرق رہا ہے
 مثلاً لندن کی حالت یہ ہے کہ اگر کسی کے مکان میں ایک کمرہ بھی خالی ہو گیا تو اسکو
 دو بھر موعا ملے فوراً پے انگ گسٹ یعنی خرچہ ادا کر نوالے مہمان کی گنجائش
 کے عنوان سے روزانہ اخبار میں اشتہار دیدیا جاتا ہے۔ وہاں ہزاروں آدمی اس
 قسم کے مہمانوں کی امداد پر زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی صورت میں اگر ایک ماں
 اسکا کماؤ لڑکا بھی اچانک آجائے تو گھر میں جگہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے اور اسکو
 کسی دوسرے شخص کا پے انگ گسٹ (خرچہ ادا کرنے والا مہمان) بنایا جاتا ہے
 یہ قیاس نہ کرنا چاہئے کہ وہاں باپ بیٹے میں محبت نہیں ہوتی محبت بہت ہوتی
 مگر اُن کا تمدن انکی روزانہ ضرورتیں اور انکی زندگی کی شکستیں سطرز معاشرت
 کے لئے انکو مجبور کرتی ہے۔ ایشیا کا تمدن ہمیشہ اسکے خلاف رہا ہے یہاں مہمان
 کو ایک قسم کے مذہبی فرض کی وقعت دیدی گئی ہے۔ ہماری ہوسائٹی میں دو ایک
 قصے مشہور ہیں جنکو لوگ کبھی کبھی بے تسخر سے بیان کرتے ہیں ایک مندرجہ ذیل

حج ہائیکورٹ تھے جنہی پوری تعلیم ولایت میں ہوئی تھی انہی نے باپ نے اطلاع دی کہ وہ آرہے ہیں۔ حج صاحب نے فوراً تار دیا کہ مکان میں گنجائش نہیں ہے ذرا آگے کیجئے۔ جب انتظام ہو جائے تشریف لائے گا۔ یا ایک ہندوستانی سرسٹھیا ولایت سے تازہ وارد ہوئے۔ باپ اسٹیشن پر لینے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سرسٹھیا ہوٹل کے قیام میں زیادہ سہولت سمجھ کر اسٹیشن سے سیدھے ہوٹل تشریف لے گئے اور اباب وغیرہ وہاں رکھ کر پھر ان سے ملنے گھر گئے ممکن ہے کہ ان واقعات میں کچھ مبالغہ ہو اور لوگوں نے حاشیہ چڑھایا ہو مگر ان دونوں مثالوں سے میرا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ تمدن بدلنے سے کسی ملک کے باشندوں کی جبلی عادات و اخلاق میں عظیم الشان فرق ہو جانا ممکن ہے کیا خوب ہوتا اگر ہم اپنے قدیم تمدن کی اچھی باتیں ہاتھ سے نہ جانے دیتے قوموں کی عاداتیں سوار نہ کیں بہت دیر لگتی ہے بگڑنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہی قانون قدرت ہے۔

باب ہشتم

یورپین تجارت سے اورنگ زیب کا تعلق

کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟
 اس سوال کا جواب سٹرجے آریٹس صاحب نے اثبات میں دیا ہے۔ اپنی رائے
 کی تائید میں جہاں تک ایٹ انڈیا کمپنی کے قول و فعل پر انہوں نے استدلال
 کیا ہے اسکی نسبت ہم چند واقعات بیان کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کے صدق
 کذب پر قومی دینے کے لئے ان کی نیت کا معلوم کرنا ایک کام امر ہو کر رہا ہے
 اسی نیت کی بنیاد پر بعض وقت ایک ظاہرہ قائل ہے گناہ نہر ایجا تلبے اور ظاہرہ
 بیگناہ شخص قتل کا مجرم قرار پاتا ہے۔ لہذا اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو امر
 ایٹ انڈیا کمپنی اور اس کے آقا دار کرس میں ہوا کرتی تھی اس سے گمان ہو
 کی کیا نیت تھی کیا غرض اور کیا پالیسی مضمحل تھی تو سارا عقدہ کھل جائیگا اور
 راز فاش ہو جائے گا میر دست توجب کوئی بند و ستانی رویش چندرت کی و
 کتاب پڑھتا ہے جہیں انہوں نے ایٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی سلیکشن
 سے استدلال کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ان ملک کی صنعت کو کس کس طریقے سے
 گاہ بگاہوں کو اندازے دیکر تباہ کیا گیا تھا تو اسکو حیرت ہوتی ہے لیکن اگر آج وہ
 تمام راز کی خط و کتابت جو ایٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں اور ان کے

آفاڈائرکٹروں کے درمیان ہوا کرتی تھی مش کر دی جا تو فرانس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اہل وطن دنگ ہو جائیں گے ہم کو اس راز کی کچھ جھلک کپتان ہلٹن کے سفر نامے سے بھی ملتی ہے یہ منجملہ انہیں واقعات کے ایک قسم ہے جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کے صدق و کذب کا پتہ چلتا ہے اور اس سے انکی نیت معلوم ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ انکے اقوال و افعال کیا تھے اور نیت کیا تھی جس کے بعد وہ تمام شہادت مشتبہ ہو جاتی ہے جو عہد مغلیہ کے نظم و نسق کے خلاف وہ گڑھا کرتے تھے۔ کپتان صاحب ایک مقام پر پتھر فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس خط کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پڑھا ہے جو ولایت ڈائرکٹروں نے بطور ہدایت نامہ یا دستور العمل اپنے تئیں عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھیجا تھا۔ اس خط میں حکومت مغلیہ سے چھٹڑ چھاپڑ قائم کرنے کی ایک تدبیر بتلائی تھی وہ یہ تھی کہ تم ہندی تجارت میں اشتیاق سے روپیہ قرض لو اور جب رقم کثیر ہو جائے تو کوئی ایسی لڑائی جھگڑا کی بات پیش نہ کیے جو جسکی وجہ سے قرضہ کا مسئلہ تو پیچھے پڑ جائے اور وہ نزاع سنا آجائے۔ اسطریقہ سے قرضہ بھی مضہم ہو جائے گا اور حکومت کے خلاف لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک جانب تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوگوں نے شاہی فوج کے غلہ و رسد سے بھرے ہوئے جہاز بمبئی کے قریب سمندر میں کھڑے اور دوسری جانب اسی کمپنی کے گورنر و ایجنٹ مسٹر چائلڈ نے ایک لمبی چوڑی شکایتی درخواست حکومت مغلیہ کے گورنر مقیم سورت کے پاس بھیجی جس میں (۳۵) شکایتیں درج تھیں اس پوری درخواست کی نقل کپتان جہانے

اپنے سفر نامے میں کر دی ہے۔ اگر میں بھی اسکی پوری نقل کرنے بیٹوں تو کسی صفحے اس کی نذر ہو جائینگے اور ناظرین کا وقت ضائع ہوگا تاہم اسکا اندازہ کرنے کے لئے کہ باوجود وضع اور بناوٹ کی سخت کوشش کے کس نوعیت کی بھاشا میں کی گئیں اس درخواست کا مختصر خلاصہ پیش کرتا ہوں یہ وہ نکلین ترین شکایتیں تھیں جو عہد اورنگ زیب میں ایٹ انڈیا کمپنی کر سکی معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کرنے پر بھی اس سے زیادہ مواد و شہادت دستیاب نہ ہو سکی۔ اس کا بیڑ کی صداقت کا تصفیہ کرتے وقت ناظرین اسکو کبھی نہ بھولیں کہ محض سائنسی درخواست تھی اور اس سے اصل مقصود لڑائی کا ہانا نہ ڈھونڈنا تھا جس کو دیگر الفاظ میں کشتی میں خاک اڑانا کہنا چاہئے۔ اس درخواست کے فقرات ۱ و ۲ و ۳ میں ایک ہندوستانی سوداگر مولانا عبدالغفار کی شکایت ہے کہ اس نے کمپنی کے نسبت غلط افواہیں اڑائیں جس سے کمپنی کا نام بدنام ہو گیا اور اعتبار بھی بمقابلہ بنا کے جاتا رہا۔ یہ وہی عبدالغفار ناجر ہے جس کا ذکر میں باب (تجارت) میں کر چکا ہوں اور جس کے متعلق کیتان ٹیلن کی یہ رائے تھی کہ صرف اس ایک متنفذ ہندوستانی کا سرمایہ تجارتی کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کے برابر تھا لہذا یہ عبدالغفار تجارت میں کمپنی کا مقابلہ کر رہا تھا۔

چوتھی دفعہ میں دو انگریز ایک سٹریٹ (Petit) اور دوسرے سٹریٹ باؤچر (Boucher) کی شکایت عجیب و غریب الفاظ میں لکھی ہے اس کے لکھنے کے بعد کہ وہ کمپنی کے رویہ کا حساب کتاب نہیں سمجھاتے اور اب شاہی حکومت کی پناہ میں بمقام سورت محفوظ بیٹھے ہوئے ہیں جو مطالبہ کمپنی کی بجائے

ان انگریزوں کی بات یہ کیا گیا تھا اسکا ترجمہ یہ ہے :-

”مشرقیہ ٹو مرگیا اور ہمس وال ہوا لیکن مشرباؤ پر سورت میں میٹھے ہوئے ہیں“

”میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اور اسکی بیوی بچے اور اس کے تمام متعلقین انگریز معہ“

”ان کے مال و اسباب کے میرے حوالہ کئے جائیں تاکہ وہ سورت سے فرار نہ ہو سکے“

یہاں تو میں اسی اقباس پر آگیا کرتا ہوں لیکن میں دوسرا باب میں دیکھا

کہ عہدہ داران کمپنی لوگوں کی بیوی بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا کرتے تھے

دفعات ۵ و ۶ و ۷ میں یہ شکایت تھی کہ حال میں بعض اشیاء پر خفیف

محصول بڑا دیا گیا ہے وہ واپس دلایا جائے (اول تو ٹیکس ہی کیا ہوتا تھا

جب کتیاں صاحباً ٹریس پیچھے ہیں تو کل ٹیکس جو ان سے وصول کیا گیا (۳)

شلنگ تھا جس میں ملازمین اور کھاروخی مزدوری بھی شامل تھی (ملاحظہ ہو جلد

اول صفحہ ۳۳۸) میں پوچھا ہوں کہ آج وہ کون دعویدار تمدن ہے جو یہ کہہ سکتا

ہے کہ کسی خود مختار سلطنت کو محصول میں رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہے

دفعہ (۸) قابل غور ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ پابندی فرامین شاہی

اس ملک کا ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ جب کبھی کمپنی کا کچھ مال سرقہ جاتا تھا تو

اسکی ملکانی خزانہ شاہی سے کر دی جاتی تھی مگر سورت کے گورنر نے اب یہ طریقہ

بند کر دیا ہے۔

(اس کے متعلق میرا یہ سوال ہے کہ مجھے بتلایا جائے کہ دنیا بھر میں آج وہ

کونسی حکومت ہے جو مال و اسباب کی حفاظت کی ذمہ داری اس حد تک

قبول کرتی ہے)

دفعہ (۹) میں کچھ ہندوستانی قرضداروں کی نادمندی کی شکایت ہے
دفعہ (۱۰) میں یہ شکایت ہے کہ شاہی دارالضرب میں روپیہ جلد جلد
مسکوک نہیں ہوتا۔

دفعات (۱۱ و ۱۲) دنا زیادہ قابل غور ہیں اور وہ یہ تھیں کہ کمپنی کی
حسابی کتابوں پر مشیہ اعتبار کیا جاتا تھا اور آخر سال پر اسکے ہی کہاتے دیکھ کر
محصول لیا جاتا تھا لیکن اب یہ قاعدہ جاری ہوا ہے کہ جو نئی مال سرزمین
پر آتا رہا جاتا ہے محصول وصول کر لیا جاتا ہے (میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہوتا
تھا تو وہ کیا بچا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور نام یورپ ہی کر رہا ہے۔)

دفعہ (۱۳) میں یہ شکایت ہے کہ گورنر نے سرکاری قلعہ کی دیواریں ہی
کرنے کے لئے کمپنی کی کچھ اراضی حاصل کر لی ہے جس کا معاوضہ ابھی تک نہیں ملتا۔
دفعات ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ میں محکمہ کرڈر گیری یعنی محکمہ وصول محصول کی
جزوی شکایتیں ہیں۔

دفعہ ۱۷ میں یہ شکایت ہے کہ قرضداروں سے روپیہ وصول نہیں ہوتا
اور انہی نیت دادرسی نہیں ہوتی اور اسد عاقلی کہ گورنر اس کی تلافی خزانہ
شاہی سے کر دے۔

(میں پوچھتا ہوں کہ اگر آج کوئی تاجر کسی حکومت سے ایسا مطالبہ کرے تو
اس کو کیا جواب ملیگا)

دفعہ (۱۸) میں یہ شکایت ہے کہ اُن کے کارندوں کو گورنر کے روپڑ
حاضری کا موقع اس وقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نوکروں کو بخشش نہیں دی جاتی۔

دفعہ (۱۹) بدین مضمون ہے کہ تجارتی گھوڑے جو ایران اور بصرہ سے آتے ہیں انکی گردنوں پر مہر کر دیا جاتی ہے اور بغیر محصول واکٹے ہوئے نہ وہ فروخت کئے جاسکتے ہیں نہ اپنی سواری کی اجازت ہوتی ہے دفعہ ۲۰ میں عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونکی شکایت ہے۔

دفعات ۲۱ و ۲۲ میں محکمہ کروڑ گیری کی تعویق و دیگر خرابی شکایتیں ہیں دفعہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ جب کمپنی اپنے انگریز ملازمین کو ہندوستان کے دور و دراز شہروں میں بھیجتی ہے تو وہ شامی گورنر کی حفاظت میں اسطرح آ جاتے ہیں کہ پھر ان سے مطالبہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور اس موقع پر بھی وہی ٹسٹ پیٹ *Mr. Elett* اور مسٹر باؤچر *Mr. Boucheer* کی مثال پیش کی گئی ہے جن کا ذکر دفعہ ۲۴ میں آچکا ہے۔

دفعہ ۲۴ میں ایک قطعہ اراضی کی بابت شکایت اور نیز جدید اراضی کے وصول کی درخواست ہے۔

دفعہ ۲۵ کا مضمون یہ ہے کہ حسبِ طور سابق محصول وصول کر کے وقت ان کا مال کو لکر نہ دیکھا جائے اور یہ کہ ان کے اعتبار پر عمل ہو (مگر یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔ آج بھی یورپ کے مالک میں یہ باب کہو لکر دیکھا جاتا ہے) دفعہ ۲۶ میں بھی عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونکی شکایت ہے دفعہ ۲۷ میں مکرر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ ۲۸ میں سہ بارہ اسی مسٹر باؤچر *Mr. Boucheer* کا قضیہ پیش کیا گیا ہے جس کا ذکر دفعات ۲۲ و ۲۳ میں کیا جا چکا ہے دفعہ (۲۹) میں سہ بارہ

پھر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ (۳۰) میں کسی ناظم کی شکایت ہے۔

دفعہ (۳۱) میں لکھا ہے کہ اُن کا لوہے کا ایک لنگر دریا میں گم ہو گیا تھا

وہ مرزا محکم کے لڑکے کو ملا ہے وہ واپس دلایا جائے اور اس کے ڈھونڈنے میں جو خرچ ہوا ہے وہ لے لیا جائے (اور اس جرم کی شکایت کی نوعیت پر غور کیا جائے)

دفعہ (۳۲) کی شکایت کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں کا جہاز ساحل ہندوستان

پر پہنچا ہے تو کروڑ لکیری پران کے آدمیوں کی روک ٹوک بہت کھینچتی ہے۔ اس میں

تعویق ہوتی ہے دفعہ ۳۳ میں قابل غور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں کمپنی کے

لوگوں نے کچھ شاہی جہاز کوڑ کر اُن میں لگ لگادی تھی اسکی بابتہ سٹر جانکڑا بیٹو

یہ شس ازنگ واولیا تحریر فرماتے ہیں کہ انکا کچھ بھی لگا داس میں ہے نہیں ہے

کہیں اس کے تسمانی سٹر جانکڑا درخواست دہندہ سے باز پرس نہ کی جا۔ (اس میں شک

اکو جو کوئی ٹپ ہے گا ہم نہیں جانتے کہ بحر خور کی ڈاڑھی میں تھکا اور کیا کہہ گا۔ اب

ایکسان ملٹن کی تحریر کے معلوم ہوا کہ خود اُن حضرت کو بھی اس قسم کے افعال کرنے

کی ہدایت ولایت سے ہوئی تھی اور اس شکایتی درخواست کا دینا اور سرکاری

غلہ کے جہازوں کو کوکڑا سب ایسی ہدایت کے موجب تھا۔

دفعہ (۳۴) میں ہندوستانی قاتلوں کی شمول کا مطالبہ ہے۔ اور آخری

دفعہ (۳۵) بدین مضمون ہے کہ شام کو شہر کا دروازہ قتل از وقت بند کر دیا جائے

اور جب وہ شہر کے باہر سے سر کر کے واپس آتے ہیں تو بغیر بخشش و انعام دئے اندر

داخل ہونا دشوار ہوتا ہے۔

بس بڑی درخواست کا مضمون ختم ہو گیا۔ قبول اس کے کہ ان شکایتوں کے متعلق کچھ لکھوں۔ ڈرامٹر جاکوٹ صاحب گارڈریسٹ انڈیا کمپنی کے کیرکٹر پر نظر ڈالئے جنہوں نے یہ شکایتی درخواست مرتب کر کے شاہ خید کے گورنر نہ سورت کے پاس بھیجی تھی۔ کیا ان مہلک اپنے سفر نامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ جب ڈرامٹر جاکوٹ ایک مرتبہ کٹمان تھا رہتے ناراض ہو گئے تو انکی جائداد ضبط کرنے اور ان کو جیل خانہ بھیجنے کی غرض سے ڈرامٹر جاکوٹ نے جعلی دستاویزات بنائیں۔ (جلداول صفحہ ۱۹۵)

ڈرامٹر جاکوٹ صاحب ایک مرتبہ ڈرامٹر بوچر (Mr. Boucher) سے ناراض ہو گئے تو ڈرامٹر بوچر کو زہر خوانی کے جو انتظامات ڈرامٹر جاکوٹ نے کیے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ (جلداول صفحہ ۱۱۴ - ۱۹۵) ڈرامٹر جاکوٹ ایک مرتبہ ڈرامٹر جاکوٹ سے ناراض ہو گئے اور جب ڈرامٹر سمندر کے قراقرظ کے ہاتھ پکڑ لئے گئے تو ڈرامٹر جاکوٹ نے قراقرظ سے لکھا کہ ڈرامٹر جاکوٹ بڑا مانڈا کر اس سے خوب وصول کرنا۔ (جلداول صفحہ ۱۹۸) یہ تو ڈرامٹر جاکوٹ کا کیرکٹر تھا۔ یہ واقعات زیادہ تفصیل سے باب نہم میں بیان کیے جائیں گے۔

جہاں تک شکایتی درخواست کا تعلق ہے۔ اب اطرین خود سمجھ لیں گے کہ ان شکایتوں کی کیا نوعیت و اہمیت تھی۔ اگر کسی غیر ملک کا تاجر آج بھی گورنر کے روبرو ایسی درخواست پیش کر کے دنیا ہی مطالبہ کرے جو اس درخواست میں کیا گیا ہے۔ تو اس کا حشر کیا ہو گا۔ جعلی لکھنؤ میں خلیہ یہ معلوم

ہو جائے کہ وہ درخواست خواہ مخواہ لڑائی کی چھڑ چھاڑ کی غرض سے پیش نہیں کرے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عہد اورنگ زیب میں اسکا نتیجہ کیا ہوا جب یہ درخواست گورنر سورت کے پاس پہنچی تو شیدی یعقوب کمانڈر افواج شاہی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر کو اولاً قہراً بآئہ طریقہ سے ایک خط لکھا جس میں کمپنی کے طرز عمل پر اعتراض کیا لیکن جب کمپنی کی جانب سے متمرانہ جواب آئے تو صوبہ دار نے بالآخر یہ تحریر کر دیا کہ اگر گرفتار شدہ شاہی جہاز ۱۱ فروری تک نہ چھوڑ دئے جائیں گے تو ۱۴ فروری کو فلاں وقت شاہی فوج بمبئی میں داخل ہو کر ہر چیز پر قبضہ کر لے گی۔ مجھ کو اس ہندوستانی فوجی انسر کی یہ سپاہیانہ ادا بہت پسند آئی کہ اُس نے دشمن کو پہلے سے اپنی آمد کے وقت تک کی بھی اطلاع دیدی کہ اگر قنبہ ہو کر سنہل جائے تو بہتر ورنہ مقابلہ کے لئے تیار ہے یہ نہ کہا جائے کہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھایا مگر سڑ چاٹکڈ پر تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈاکٹر کٹر کی حمایت کا نشہ سوار تھا۔ اُس نے انہیں یہ لوگ بغیر فوجی مدد کے سمندر میں سفر نہیں کر سکتے تھے ولایت کے راستے بحری قزاقوں کی دست برد سے محفوظ نہ تھے علاوہ انہیں وہ یہ عہد نہ تھا کہ کسی قوم کے ہتھیار لیکر اسکو نامرد بنایا جا سکے۔ ہر شخص راکر تھا۔ انڈیا کمپنی کے پاس بھی فوج تھی تو میں شخص خزانہ تھا اور غالباً اسی غرض سے پرائیوٹ جنگ جہازوں کی جرات ہوئی تھی۔ کپتان ہلٹن لکھتے ہیں کہ جو کچھ شیدی یعقوب شاہی فوج کے کمانڈر نے مشر لکھا تھا بالکل اسی کے مطابق اس نے عمل کیا اور جو وقت اُس نے مقرر کیا تھا ٹھیک اسی وقت معہ فوج کے پہنچا۔ (جلد اول صفحہ ۷۱) آخر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور

سعرہ میں شیدی کی فوج تلواریں ہاتھ میں لیکر لمبا کرتی ہوئی انگریزی فوج پر جا پڑی۔

”تو کمپنی کا کپتان میدان سے بھاگ نکلا اور بھاگنے والوں میں بھی سب سے آگے تھا۔ پرتگیزیوں کے گرجے میں پہنچ کر جب دُعا اس کے حواس درست ہوئے تو اُس نے پیچھے ٹکرائے اپنے آدمیوں کو دیکھا کہ اُنکا کیا حشر ہوا۔“

(کپتان ہلٹن جلد اول صفحہ ۲۲۰)

کپتان صاحب پر یہ سب سرگزشت بیسی تھی وہ خود اسی بھنور میں گرفتار تھے اور معاملہ کو بحسب خود کچھ سمجھتے تھے۔ از بسکہ انہی حقیقت کمپنی کے ملازم کی نہ تھی وہ ایک آزاد خود مختار تاجر تھے مگر مشکل دوسرے انگریزوں کے وہ بھی کمپنی کی حفاظت میں رہتے تھے وہ کمپنی کی اس ریزول حرکت پر بہت متحیر ہوئے اور اپنے سفر نامہ میں انہوں نے سارا بھانڈا اچھوڑ دیا۔ اگر راوی کا بیان راوی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا تو بہتر تھا۔ مگر وہ انگریزی میں ہے اس لئے ابتداء سے جو واقعات انہوں نے بیان کئے ہیں اُن کا ترجمہ کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ:-

”کمپنی کے پاس یوں تو بہت سے بڑے بڑے جہاز تھے جن کو ملک سے باہر بھیجے گئے لئے وہ مجبور تھے لیکن اُن کو کام میں لانے کے لئے چونکہ کمپنی کے پاس کوئی ”سرمایہ نہ تھا اس لئے اس نے اپنے جہاز کو اور نیز اپنے ان کارخانوں کے ”عمیدہ داروں کو جو ہندوستان میں تھے حکم دیدیا تھا کہ وہ اپنے جہازات و طن لے جائیکے لئے ہندوستانی تاجروں سے جو قدر رقم قرض حاصل کر سکتے ہوں کمپنی

”کی ذمہ داری پر لے لیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جو جہاز وہ اپنے وطن کو نہ لے جاسکے انکو کرایہ پر ہندوستان میں چلایا یا اپنے کمپنی کے گورنر کا ایک خط انگلستان میں دیکھا جس میں یہ لکھا تھا کہ جب وہ محل شہنشاہ کی رعایا سے ”جہتقد روپیہ حاصل کر سکتے ہوں لے لیں تو قرض خواہوں جہگڑا کر کے ایک نکتہ ان کے ساتھ لین دین متوقف کر دین چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کیونکہ ۱۶۸۶ء و ۱۶۸۷ء میں سورت کے ہندوستانی تاجروں نے سمندر کے راستے سے مغرب میں بہت بڑی تجارت مٹا۔ ایران اور بصرہ سے قائم کر لی تھی اور مشرق میں بنگال و چین اور سیام سے بویا کرتے تھے وہ جنرل بس لوگوں کو ان کی اسدھار پر روانہ راہداری دیکھ کر اتنا ہراس کے بعد ۱۶۸۸ء کے آخر میں ایک شکایت صوبہ دار سورت کے روبرو پیش کی اور انصاف و اطمینان کا مطالبہ ہوا۔ اس شکایت کی ایک ”مطبوعہ کاپی میں نے خود دیکھی ہے۔ وہ جب ذیل (۳۵) فقرات پر مشتمل تھی“

(جلداول صفحہ ۱۹۹)

”سفر نامے میں اس جگہ پوری درخواست نقل کر دی گئی ہے جس کا خلاصہ یہاں کیا جا چکا ہے۔ انگریزی کیرکٹر کا ایک نسخہ ہمیشہ ایسا رہا ہے جسکی تعریف و مدح کرنا نہ صرف مزاج کا فرض ہے۔ جب کبھی وہ ڈپلومیسی و سیاسی اخراہن سے بلند پروازی کر جاتا ہے تب اسکی آزادانہ رائے میں ایک ایسی دلکش و دلغیرب خوبی پیدا ہو جاتی ہے جس سے دوسری قوم والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ اس موقع پر کپتان مہلٹن نے بھی اسی انگریزی کیرکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ آخر تمام بنی نوع انسان ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ہیں اور نیکی و

و بدی کی حرکات سے ہر انسان کا دل یکساں متاثر ہوا کرتا ہے۔ ان شکایتوں کی نسبت کپتان جلیٹن نے جو رائے قائم کی تھی وہ انسان کی اصلی خلقی صورت پسندھی کا نمونہ ہے۔ درخواست کی نقول کرنے کے بعد کپتان صاحب لکھتے ہیں:

”یہی وہ شکایتیں ہیں جن کی بنیاد پر جہل چاٹلڈ نے سلطنت مغلیہ کے ساتھ ایک جنگ کی عمارت قائم کی اور اپنی شکایات بادشاہ تک پہنچانے اور نشانے شاہی معلوم کرنے کے بغیر اعلان جنگ کر دیا۔ جہاں کہیں بادشاہی رعایا کے جائزے انکو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ جہاں خود انہیں کے عطا کردہ پروانجات دلائے پاس رکھتے تھے شکایت مذکورہ کا فقرہ (۴) ایسا ہے کہ گو وہ ایک عیسائی قلم سے لکھا ہے لیکن مسلمان اور بت پرست بھی اسکو نفرت کی نظر سے دیکھ گئے۔“

فقرات نمبر ۱، ۲۳ و ۲۸ خلاف انصاف ہیں اور فقرات نمبر (۳ و ۳۱) اس شکایت اور جنگ کے لئے بہت ہی کمزور وجوہ ہیں جسکی وجہ سے مسٹر چاٹلڈ نے آقا اور مالکوں کے رائے اور چار لاکھ پونڈ اختتام جنگ سے قبل ہی خراج ہو گئے علاوہ ازیں بادشاہ اور اسکی رعایا کے نزدیک ان لوگوں کا اعتبار الگ جاتا رہا جو آج تک پوری طرح جیسا کہ چاہئے قائم نہیں ہوا ہے۔ وہ کون قاعدہ اور پالیسی تھی جسکے بموجب یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ باوجود اس کے کہ بادشاہ کے ایک حصہ حکومت میں تو مسٹر چاٹلڈ یا سر جوزیا (Messrs Josias & Co) بادشاہی رعایا کو قتل و غارت کریں اور بادشاہ موصوف اپنے دوسرے حکومت

میں کمپنی کو امن و امان کیساتھ تجارت کرنے کی اجازت دیں۔ نہیں معلوم یہ لوگ کچھ اسکی امید کر سکتے تھے کہ ایسے موقع پر بادشاہ غیر جانبداری کی صورت اختیار کرے۔

”اُس سوال کا جواب تو وہ بد بریں گے جن کو پالیسٹریس نے مل ہے۔ میرے“
 صرف اصلی واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں“

(جلد اول صفحہ ۲۱۳)

معلوم ہوتا ہے کہ سر جوزیا (J. J. Smith) وہی حضرت ہیں جو
 بنگال میں ایسے افعال کے مرتکب ہو چکے تھے کہ جی وجہ سے مسٹر چائیلڈ کو بھی
 اپنی درخواست کی دفعہ ۳۳ میں پیش بندی کرنی پڑی۔ بہر حال جب خود
 ایک بے غرض اور بے لوث انگریز نے اس طرح اپنی رائے ظاہر کر دی تو سہیل
 کچھ اضافہ کرنا غیر ضروری ہے البتہ اس سے چند نتائج ضرور اخذ کئے جاسکتے
 ہیں اول یہ کہ ایٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ سلطنت مغلیہ کی طرف سے پہلے بہت
 رعایت کی جاتی تھی مگر کمپنی مذکور بجائے اس کے کہ وہ سلطنت موصوفہ کی شکوہ
 اور خوش کردارگی سے اپنے متعلق مزید مراعات شاہی کا مستحق بناتی اُس نے
 پچھلے اعمال کئے کہ اس کے اعتبار میں فرق آگیا۔ دوسرے یہ کہ عہد اورنگ زیب
 میں محصول کے متعلق زیادہ جلیخ پڑتا تھا شروع ہوئی جو کمپنی کو بڑا معلوم
 ہوا عجب نہیں کہ اسکی ضرورت بھی خود کمپنی ہی کے اعمال کی وجہ سے سلطنت
 کو ہوئی ہو۔ تیسرے یہ کہ اُس زمانہ کی گورنمنٹ کو غیر مالک کے تجارت کی
 جان و مال کی حفاظت کا اس قدر خیال تھا کہ اگر انکا کوئی مال سرقہ جاتا
 تو خزانہ شاہی سے اسکی تلافی کی جاتی تھی اور اس ذمہ داری کی وجہ سے غالباً
 جلیخ پڑتا تھا میں جدوجہد کی کامل ضرورت ہوتی تھی اور یہ صحیح نہیں کہ محض
 وصول محصول کے لئے ایسا کیا جاتا تھا۔ محصول وصول کرنے میں جو جلیخ پڑتا تھا

کی سختی کی جاتی تھی اس کی نسبت ایک امر کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جن لوگوں نے یورپ کا سفر کیا ہوا انکی نگاہ سے وہ سماں گزرا ہو گا جب کہ ایک فرانسیسی کسی انگریز یا جرمن مسافر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر بعض وقت صرف اس خیال سے کہ محصولی مال چھپا رکھا ہوا طرح ہوتا ہے کہ گویا وہ مسافر چور ہے۔ غالباً احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے کیونکہ مجھ سے خود ایک یورپین نے کہا کہ ایک مرتبہ انکی لیڈی صاحبہ بہت سے سگریٹ اپنے انڈر ویر پٹے اندر پہنے کے کپڑوں میں چھپا کر فرانس لے گئی تھیں گزشتہ سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے کہا کہ پیرس میں ایک جٹلمین صاحب اپنا اباب گورنمن کے سپرد کر کے چلے گئے اور جب محصول لینے والا آیا تو دریافت کیا تو گورنمن صاحبہ محصولی مال کے ہونے سے صاف انکار کر گئیں مگر جب ایک کس بطور نمونے کے کہو لا گیا تو اس میں محصولی مال برآمد ہوا پھر تو ہر کس کھولا گیا جس سے سارا اسٹیشن ایک اچھا خاصہ دنیا بازار بن گیا خیر یہ توجہ مقررہ تھا جو موجودہ زمانہ کے حالات اور واقعات سے متعلق تھا۔ یہاں اصل عہد اورنگ زیب کا ذکر ہے لیکن موجودہ واقعات کے تعلق سے ہم یہ سوچتے ہیں کہ عہد موصوفہ میں محصولی اباب کی جانچ پڑتال میں کدو کاوش یا شح محصول کی رد و بدل میں حکومت نے کیا جرم کیا تھا وہ لوگ جن کو بادشاہ نے اپنے ملک میں تجارت کی اجازت دی تھی۔ انہیں عطا کی تھیں۔ جو بادشاہ کے سایہ عاطفت میں باطمینان صرف بسر ہی کرتے تھے بلکہ تجارت کی بدولت وہ ہندوستان کی دولت سے بھی مستفید ہوتے تھے۔

انہیں لوگوں نے ایسی ناشکری اور کمسنہ من کی حرکت کی جس سے خود اُن ہی کی قوم کا ایک فرد متفرق تھا اس وقت اورنگ زیب کی قوت مسلمہ تھی اُس کو انگریزی تجارت کا خوف نہ تھا اس کے قلم کی ایک گردش ان کی تجارت کا خاتمہ کر سکتی تھی عہد اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حالت ایک شیرخوار بچہ کی تھی چنانچہ وہی لوگ جنہوں نے یہ شکایتی درخواست اس زور و شور سے بھیجی تھی اور جنگ کی تھی اُن کو اپنی ناعاقبت اندیشی کے خمیازہ میں اورنگ زیب کے حضور میں حاضر ہونے اور معافی حاصل کرنی کی تدبیر کرنی پڑی۔ ایک وفد تیار کیا گیا جس میں کپتان ہلٹن بھی شریک تھے اور جنرل ت آئینہ طریقہ سے یہ وفد شاہجاں آباد میں اورنگ زیب کے حضور میں پیش کیا گیا اس سے کپتان صاحب کی یہ قدر تکلیف ہوئی کیونکہ وہ انکی قومی خود داری کے بہت ہی خلاف تھا۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں:—

”دربار میں انکی رسائی تو ہو گئی لیکن اورنگ زیب کے حضور میں وہ اس وقت کے ساتھ پیش کئے گئے جو کسی ملک کے سفیروں کے لئے زیبا نہ تھی۔ سامنے لگے دونوں ہاتھ ایک پٹے سے باندھ دئے گئے تھے اور اس حالت سے بادشاہ کے روبرو خمیدہ پشت میں بوس ہست میں پیش کئے گئے“

(جلد اول صفحہ ۲۲۴)

یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی کیفیت تھی اور اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ بالآخر اورنگ زیب نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔ اورنگ زیب کا اصلی کیر کر جانچنے کا یہ بہت نازک وقت تھا۔ یہی وہ مواقع ہوا کرتے ہیں جن پر

ایک بادشاہ کا اصلی کیر کٹر معلوم ہوتا ہے جب مرور زمانہ سے انسانی جذبات کا بادل چھٹ جاتا ہے اور مروج کے سامنے صرف سچائی اور اصلیت کا صاف مطلع باقی رہ جاتا ہے تب ایسے ہی وقت کے افعال میں نظر پڑتا ہے۔ آج سواد و سو برس کے بعد ہم اس امر کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں کہ کیا اورنگ زیب نے اگر یزیدوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ میری رائے میں اورنگ زیب نے جو طرز عمل ایسے موقع پر اختیار کیا اُسی سے اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کیا اس بادشاہ کا یہ مقصود تھا کہ اہل یورپ ہندوستان میں تجارت نہ کرنے پائیں؟

درخت کی ایک پتی کی حرکت سے نہیں بلکہ بعض وقت ایک تنکے کی حرکت سے سینکڑوں میل کی ہوا کا سچ معلوم ہو جاتا ہے اُسی طرح بعض وقت انسان کے ایک فعل سے ہی اس کے تمام کیر کٹر کا یہ چل جایا کرتا ہے۔ اس موقع پر مغلوں غالب کے پاس جاتا ہے۔ آغا جو قادر کے روبرو حاضر ہوتا دیکھنا یہ ہے کہ غالب وقادر کیا کرتا ہے۔ کتیاں تھلن لکھتے ہیں کہ جب یہ وفد اورنگ زیب کے روبرو پیش ہوا تو بادشاہ پہلے تو بہت غیظ و غضب میں معلوم ہوتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ غصہ اتر گیا تب بادشاہ نے دریافت کیا کہ تمہاری کیا درخواست ہے وفد نے پہلے قصور کی معافی مانگی اور بعدہ دوبارہ تجارت کرنے کی اجازت چاہی اور سوقت اورنگ زیب نے اپنے اصلی کیر کٹر کا اظہار کیا اور الطاف شاہی سے یہ دونوں درخواستیں منظور کر لیں۔ وفد کو حکم ہوا کہ وہ بمبئی واپس جا بعدہ فرمان مبارک

بہجائے میگا چنانچہ کچھ روز بعد فرمان شاہی اُن تمام لوازمات کے ساتھ شرفِ صدر لایا جو ایسے موقعوں پر بطور اعزاز و اکرام مبدول فرمائے جاتے ہیں۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ سورت میں ایک بڑا دربار منعقد کیا گیا۔ اس دربار میں وہ فرمان شاہی پڑھا گیا جس کا ترجمہ کتاب نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اور جس کا اب اردو ترجمہ میں پیش کرتا ہوں۔ لوازمات فرمان شاہی یہ تھے کہ فرمان کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ گھوڑا و بیش قیمت اطلس یا زربفت کا خلعت بھی جس پر کارچوبی سنہری روپوں کی گل بوٹے کاٹھے گئے تھے عطا ہوا۔ یہی فرمان وہ چارٹر (Charter) و نشور خسروئی تھا۔ جو اورنگ زیب کے شہسوار سے کمپنی کو عطا ہوا تھا اور جسکی سند پرایٹ انڈیا کمپنی نے پھر ہندوستان میں تجارت شروع کی تھی۔

ترجمہ فرمان شاہی اورنگ زیب بنام ایٹانڈیا کمپنی

”تمہاری عرض داشت بدین مضمون ابدولت و اقبال کے ملاحظہ میں آئی
کہ جو قدر فتنہ و فساد پیدا ہوا اسکے تصور و ارتعم ہو۔ تم نے صوبہ دارانِ سنہ
کے خلاف متعدد شکایتیں کی ہیں جن کا ذکر ابدولت نے اپنے امراء و دربار
میں کیا۔ تم کو یہ شکایت تھی کہ صوبہ داروں یا ماتحت عہدہ داروں نے تمہارا ساتھ

”بدسلوکی کی تم کو لازم تھا کہ شوش برپا کرنے سے قبل ان سب باتوں کی اطلاع تم
 ”مجھ کو دیتے۔ لیکن اب چونکہ تم اپنی خطا کے معترف اور خواستگار معافی ہو لینا
 ”واقعات گزشتہ کو معاف کر کے صرف تمہاری درخواست ہی منظور نہیں کی جاتی
 ”بلکہ تمہارے حسبِ تہ حاجتم کو ایک فرمان بھی عطا کیا جاتا ہے اور اسدخان
 ”کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بعد از تمام تفصیلات جنکی اطلاع وہ تم کو دیدیگا فرمان
 ”صوبہ دارسورت کے پاس روانہ کر دے جس وقت یہ فرمان نافذ ہو تم اس کو
 ”تعظیم و احترام کیا تہ وصول کرو اور اسکی عزت و شرف کا اقبال و اعتراف کرو
 ”جو فرمان مذکور صادر کر کے تم کو بخشا گیا ہے جیسے تم پیشتر تجارت کیا کرتے تھے
 ”اب بھی اسی طرح حسبِ معمول تجارت کرنیکی تم کو اجازت دی جاتی ہے۔ جن جہ
 ”کی تم شکایت کر رہے ہو تم پر واجب ہے کہ ان کے جہازات معسلمان ان کے
 ”حوالہ کر دو اور آئندہ سے اس قسم کی غلطی کبھی نہ کرنا جس کے تم اس مرتبہ متذکر ہو
 ”ہمیشہ مابدولت کی خوشنودی و رضا جوئی کے امیدوار رہو۔ اور اسکو کبھی نظر انداز
 ”نہ کرو۔ اگر تم کو میرے صوبہ داروں عہدہ داروں یا میری رعایا کسی قسم کی
 ”اذیت پہنچے تو اسکی اطلاع دینے میں کبھی فروگزاشت نہ کرو۔ مابدولت نے
 ”اسدخان کو حکم دیدیا ہے کہ وہ اسی کے مطابق تحریر کرے۔ یسعی باؤچر کی
 ”پناہ دہی کے متعلق تم نے شکایت کی ہے کہ سابقہ صوبہ داروں نے اسکو اپنی
 ”پناہ میں لے لیا ہے اور نامبروہ پر تمہاری کئی رقوم واجب الادا ہیں اور اس نے
 ”تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے سپرد کر دیا جائے۔ اس بار میں حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنا دعو
 ”(عدالت میں) بروکانون ثابت کرو اسوقت جو مخصصا انصاف ہوگا عمل میں آئے گا

”۳۱ جلوس اورنگ زیب“

(جلداول صفحہ ۲۲۷)

یہ فرمان اورنگ زیب کے کیرکٹر کی کجی ہے۔ اس فرمان سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کے نامہ دہوار کر دیا تھا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رویہ کا مقابلہ اورنگ زیب کے الطاف و کرم سے کیجئے۔ وہ مورخ جسکو اصلی واقعات نہیں معلوم جو چاہے کہے یا کہے مگر سچے میں اس انگریز کے دل پر جو اس وفادار شریک تھا۔ اورنگ زیب کے رحم و کرم شانہ نہ کا جو اثر ہوا وہ یوں ظاہر کرتا ہے:-

”یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ انکس بدلو کی سے جو اسکی رعایا کے ساتھ کی گئی تھی“
 ”ظلم نہ تھا۔ بائیں ہمہ وہ جرائم اور خطاؤں کے پاداش میں کچھ سخت سزا بھی نہیں“
 ”دینا چاہتا تھا اس لئے اسنے ایک رحل بادشاہ کی طرح ان لوگوں کو ان کے قصو“
 ”سے آگاہ کر دیا اور ان کو دانستہ نہ نصیحت کی کہ آئندہ ایسی غلطی کے پھر نہ کرے“
 ”میں شائد نہ طریق سے انکو سمجھا دیا کہ وہ عنایات و عطوفات شاہی کو منظر“
 ”شکر و سپاس دیکھیں اور پابندی قانون کو اپنا مسلک قرار دیں۔ عرض کہ اس بادشاہ“
 ”نے تمام اقوال و افعال میں پوری طرح سچی محنت کا کام لیا“

(جلداول صفحہ ۲۲۹)

آج کلکتہ میں جس مقام پر فورٹ ولیم قلعہ بنا ہے وہ زمین کنسے اور کنسے کو دی تھی؟
 کہ پتان صاحب لکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اورنگ زیب

کی رعایا پر تسل و غارتگری کیا کرتے تھے۔ اور ڈاکے مارا کرتے تھے لیکن ایک
 قلعہ پر اورنگ زیب نے ان خونریزوں کو معاف کر کے کمپنی کے ایجنٹ وکٹوریہ
 مسٹر جوہن پیناک کو یہ حکم دیا کہ وہ بنگال میں کوئی زمین اپنے قیام گاہ و
 مال و اسباب کی منڈی قائم کرنے کے لئے خود منتخب کر لیں تب اس کمپنی
 نے ۱۶۹۰ء میں وہ زمین دیا ئے ہنگلی کے کنارے انتخاب کی جس پر تاج
 قلعہ فورٹ ولیم نظر آ رہا ہے۔

(جلد دوم صفحہ ۵۸)

ان واقعات کے بعد یہ کہنا کہ اورنگ زیب تجارت کا حامی و مددگار
 نہ تھا سخت بے انصافی ہوگی۔ یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حرکات کا ذکر
 تھا مگر ہندوستان صرف انگریزوں کا بازاری گاہ نہ تھا بلکہ دوسری یورپین
 قومیں بھی یہاں تسکا رکھیں ہی تھیں اور ان میں قابل ذکر ڈچ ہیں جن کا
 ذکر باب نہم میں کیا جائیگا۔ یہ جو چند واقعات یہاں لکھے گئے ہیں یکے
 از ہزار و شکستے از خروارے ہیں تاہم انہیں واقعات سے اس سوال کا
 جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا
 دشوار کر دیا تھا؟ جو واقعات اس مضمون میں درج ہیں ان سے ثابت
 ہوتا ہے کہ انگریزوں اور ڈچوں نے اورنگ زیب کی حکومت میں کس طرح
 کی دشواریاں پیدا کرنی چاہیں مگر اورنگ زیب نے اپنے الطاف شانہ
 سے انہی خطاؤں سے چشم پوشی کی اور تجارت میں ہمیشہ ان کو مدد دی جس
 وجہ سے ان کو اور ان کے ملک کو وہ تمول نصیب ہوا جس کا ذکر تجارت

تجارت کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ آج ان سب باتوں کو بھول جانا سخت ناشکری ہے۔

باب نہم یورپین تجارت کی پالیسی و اخلاق

اس باب میں ایک کامیاب ڈپلومیسی اور بدترین اخلاق انسانیت کے عجیب و غریب اجتماع کا ذکر کیا جائیگا اور یہ دکھلایا جائیگا کہ باوجودیکہ اس ڈپلومیسی کے حاملوں کی اخلاقی حالت کسی کچھ متبذل اور دیانت سے دور تھی مگر اس نے کیونکر ایک ہندوستانی سلطنت کو مٹا کر اپنا منشاء پورا کر دکھا یہ قدرت کا کرشمہ ہے جس سے ایسے عظیم الشان تغیرات ظہور پذیر ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسے ایک سلطنت کا صفحہ ہستی سے مٹنا اور دوسری کا قائم ہو جانا۔ چونکہ اس ڈپلومیسی کی ابتداء عہد اورنگ زیب میں ہوئی لہذا اس کتاب میں اسکا ذکر راجا ضروری تھا۔ شاید یہ ہی غلطی اورنگ زیب کی دوراندیشی کے خلاف تھی کہ بادشاہ موصوف نے اپنی تمام قوت کل ہندوستان کو ایک متحد بڑی ایمپائر *Empire* یعنی عظیم الشان سلطنت کی صورت میں متحد کر دینے میں صرف کردی اور ان کٹروں کو نہ دیکھا جو کہ نظر سے دور رہ کر یہیں اس بڑی سلطنت کی عمارت کی بنیاد کو کھود کھود کر مہر کر رہے تھے

جس کو یہ بادشاہ اس شان و شوکت کے ساتھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اورنگ زیب نے اس دار فانی سے رحلت کی بظاہر عظیم الشان عمارت تو بنکر تیار ہو گئی لیکن چونکہ بنیاد تو کمزور ہو گئی تھی ایک تندہ ہوا کے جھونکے نے اسکو گرا دیا جس تدبیر سے یہ بنیاد کمزور کی گئی وہ ایسی نوٹزدلو ہے جس کا نشانہ اس ملک میں کبھی خالی نہیں گیا ہندوستان کے اس حصہ تاریخ سے جو سبق ملتا ہے وہ کسی قوم و ملت کو نہ بھولنا چاہئے بلکہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ جو انسان اپنے گزشتہ تجربہ سے آئندہ کے لئے سبق نہیں حاصل کرتا وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار و ناکامیاب رہتا ہے اسی طرح سے جو قوم اپنی قومی سوانح عمری اور تاریخ سے سبق نہیں لیتی وہ ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے بلکہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

جس ڈپلومیسی کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اور جس سے سبق حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ تھی کہ دو قوتوں کو لڑا کر ایک قوت کا ہمدرد بننا اور اس سے سلطنت و حکومت میں کچھ حقوق حاصل کرنا پھر جب حاصل شدہ حقوق مستحکم ہو گئے تو اسی ڈپلومیسی سے آگے قدم بڑھانا اور نئے حقوق حاصل کرنا اسی طرح سے رفتہ رفتہ دونوں قوتوں کو مٹا کر خود بلا شرکت غیرے ملک کا بادشاہ بن جانا انسانوں کے کسی طبقہ کے عیوب بیان کرنا کوئی خوش کن کام نہیں ہے لیکن فلسفہ تاریخ سمجھنے کے لئے اور سبق حاصل کرنے کے لئے بعض وقت اسچے واقعات کا بیان گرا ضروری ہو جاتا ہے۔

بادی النظر میں سے پہلے اس ڈپلومیسی کی ابتداء ہندوستان میں چو

کی تھی۔ ہندوستان میں ڈچوں کی پالیسی کی بابت کپتان صاحب نے
منہ عام میں جو خیال ظاہر کیا تھا وہ حسب ذیل ہے:-

”اس ایماندار کمپنی نے ہمیشہ سے یہ قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اول تو وہ ہندوستانی
رہنوں اور حکمرانوں میں لڑائی کر دیتی اور پھر بڑے اظہار دیانت داری کرتی
اُن کے جھگڑے قضیے چکانے کے لئے خود ثالث اونچ بن جاتی اور ہمیشہ میز اعدا
کا پلا اس کے حق میں بھاری کر دیتی جس کے ملک کی پیداوار یا جس کے مال
کمپنی کے لئے بے سے زیادہ کارآمد ہوتا تھا۔ اور ہمیشہ اسی ٹیس کو اسلحہ جنگ
سے مدد دیتی تھی جسکو مدد دینا کمپنی کے مفید ہوتا اور جنگ ختم ہونے پر وہ
غریب بھتیج کی گردن پر ان تمام مصارف کا بوجھ ڈالتے تھے جو فاتح کی مدد
دینے میں عائد ہوتے تھے جب یہ سب کچھ ہو جاتا اور عہد نامہ پر دستخط کرنے کا
وقت آتا تو کمپنی جو کہ دوستی کا دعوے کرتی تھی اپنے دوست کا بہترین گاہ
معاوضہ میں لے لیتی۔ اس پر قلعہ بندی کرتی اور پھر سوائے ڈچوں کے دوسرے
کو اس بندرگاہ پر تجارت کی اجازت نہ دیتی اور اگر اس کے خلاف کچھ ہوتا تو
کمپنی کی فوج بہ شرکت کسی دوسرے دشمن کے اُس کے مقابلہ پر تیار کی جاتی“

(جلد اول صفحہ ۳۳۵)

کپتان ہلٹن کی رائے میں یہ طرز عمل ڈچوں کا اس ملک میں تھا لیکن
میری رائے میں صرف ڈچوں کو اس غیر متحکم پالیسی کا الزام نہیں دیا جاسکتا
بلکہ یہ کہ اسکی بنیاد ڈچوں ہی نے ڈالی ہو مگر رفقہ رفقہ تمام یورپین
اسی پالیسی پر عمل کرنے لگیں۔ من حیث الامتات

ان پر کوئی نئے الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ دوسروں پر زیادت و فوقیت حاصل کرنے کا خیال جیسا کہ دوسو برس پہلے تھا ویسا ہی اب بھی موجود ہے ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ اُن کے حصول کے طریقہ بدل گئے ہوں مگر "اات و جذبات" حرص و ہوا اور انسانی فطرت کا تقاضا آج بھی وہی ہے اسکو مذہب و قومیت سے بھی تعلق نہیں ہے مسلمان و عیسائی۔ انگریز و فرانسیسی سب اس انسانی کڑی کے شکار بن چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اسٹیٹسمین یعنی مدیرین و اہل سیاست کا اخلاقی دستور العمل زمانہ میں ممبر پر ممبر کو عطا کرنے والوں سے بالکل جدا گانہ ہوا کرتا ہے۔

۱۹۸۸ء کے قریب جو خط ولایت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہداروں کے پاس بدیں مضمون آیا تھا کہ ہندوستانیوں سے بڑی بڑی زمینیں قرض لیکر جہاز ولایت کو بھیج دو اور پھر حکومت اور نگراریت کسی نہ کسی طرح سے جنگ کے وجہ پیدا کر کے رویہ مضمر کر لو اس کا تذکرہ "باب ہشتم" میں کیا جا چکا ہے جس سے ثابت ہوا کہ خدا ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ طرز عمل بھی اسی پالیسی پر مبنی تھا جس کا اتہام کپتان صاحب نے ڈچوں پر اس وقت لگایا تھا۔

ایک مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۷۱۴ء میں:—
 "زومرن کے راجہ نے ڈچ کمپنی سے جنگ کی خبر میں انگریزی فیکٹری اور اسٹور
 نے جو راجہ زومرن کا مشیر خاص تھا۔ آتش جنگ بھڑکانے میں بہت کچھ حصہ
 اُتوت تو ڈچوں کا قلعہ "فتح کر لیا گیا۔ لیکن پیر انگریز مشیر نے اپنا ہی جھنڈا

”اُس لمحہ پر نصب کروادیا اور بالآخر نتیجہ میں اس بازی میں ہرگز ہار نہیں گئی“
 ”مار ہوئی“

(کپتان ملٹن جلد اول صفحہ ۲۱۲)

اسی طرح سے سیام میں جب انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو یہ معلوم ہوا کہ کمپنی پر قرضہ بہت ہو گیا ہے تو انہوں نے ذمہ کا رخا نہ کو محض اس لئے اُنک لگا دی کہ شاہ سیام کی رعایا پر اس حرکت کا الزام لگا کر شاہ سے تاوان وصول کریں اور انکار کرنے پر جنگ چھیڑ دیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۰۰)

اس قسم کے واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی میں اور دُچوں کی پالیسی میں کچھ فرق نہ تھا اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کے بعد دوپلے فرانسیسی گورنر اور کلایو انگریزی گورنر کی سرگرمی اور زور زما کی فتح اور شکست ہندوستان میں بس اسی غرض و غایت سے تھی کہ اس کی پالیسی میں کون سبقت لیجا تا ہے اور بالآخر اس پالیسی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کوئے سبقت دے گئی اور نتیجتاً انگریز اس ملک کے حکمران ہو گئے اس موقع پر مجھے خیال آتا ہے کہ تمدن ہند کے فتح مصنف نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ملک گیر میٹنگتان سے ٹکھنا چاہئے اس سے ہندوستان کی مثال پیش کر کے لکھا ہے کہ انگریزوں نے یہ ملک ہندوستانوں ہی کے خون اور روپیہ کی مدد سے فتح کر لیا اس ملک کے فتح کرنے میں جتنی بڑی بڑی لڑائیاں انگریز لڑے اُن میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہیوں کا خون بہا تھا اور

اخراجات جنگ اسی ملک کے روپیہ سے ادا کئے گئے تھے نہ انگریزوں کا
ایسا خون بہا جو بیان کے قابل ہوا اور نہ اس کے ملک کا روپیہ صرف یہاں
شک نہیں کہ اگر کسی ملک گیر کو ملک گیری کا مقصد اس طرح سے حاصل ہو سکتا
تھا تو نیا سوسیٹیت سے کوئی دوسرا طرز عمل اختیار کرنا اس کی بڑی حماقت
ہوتی۔ ہندوستانیوں نے اگر اس کا مقابلہ عقل سے نہ کیا تو یہ ان ہی کا
قصورتھا اور اب بھی اگر ہندوستانی اس سے سبق لے کر عقل سے کام لیں تو
انکو کوئی منع نہیں کرتا۔

یہاں تک تو کامیاب پلومیسی کی نوعیت بیان کی گئی اب ان
حضرات کی اخلاقی حالت کو ملاحظہ فرمائے جو اس پلومیسی کی مدد سے
ہندوستانی سلطنت کی بیخ کنی کر رہے تھے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ اس ملک
ہندوستانی سلطنت اس وجہ سے نہیں گئی کہ اس کے دشمنوں میں کوئی خاص
انصاف کا مادہ یا انسانی اخلاقی خوبیاں تھیں جنکے اثرات نے اس
سلطنت کو معرض زوال میں ڈال دیا تھا۔ کپتان ہلٹن کا تمام سفرنامہ
میرے اس خیال کا شاہد ہے۔ اس زمانہ میں جو پوچھ گچھ ہندوستان میں
تجارت کی غرض سے آتے تھے ان کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ
جو شخص ان پر بہروسہ کرتا تھا اس کو دھوکہ دینے میں وہ کبھی ہرچ کتے تھے

(جلد دوم صفحہ ۷۷)

شاہ ملگو نے ایک پریگنر کو اپنی فوج کا جنرل مقرر کیا تھا وہ استبداد
اور گستاخ ہو گیا تھا کہ ایک دن جب وہ ماتھی پر سوار کسی دولہن کے مکان

اُس کے والدین کو مبارکباد دینے کے لئے گیا۔ دو ماہن کو دیکھ کر ایسا مفسون اور از خود رفتہ ہو گیا کہ وہ اُس ایک دن کی بیاسی عروں کو زبردستی پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔
(جلد دوم صفحہ ۳۸)

سمندر کے راستوں پر لوٹ مار کرنا اُن کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔
(جلد اول صفحہ ۱۶۴)

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو اصل سٹریٹجی میں سے ایک یہ تھا کہ وہ اپنے ملک میں کلکتہ اور صوبہ سورت میں ممبئی۔ بنگال میں مشرقی بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایجنٹ تھا اس کو شہنشاہ اورنگ زیب نے اجازت دیدی تھی کہ وہ اپنی تجارت کی منڈی کے لئے کوئی جگہ خود منتخب کر لے چنانچہ ۱۶۹۱ء میں اُس نے اُس مقام کو منتخب کیا جہاں کہ اب فورٹ ولیم کا قلعہ واقع ہے کپتان ہلٹن نے اس سٹریٹجی کے بڑے کروت اپنے سفر نامہ میں تحریر کئے ہیں۔ ایک مقام پر لکھا ہے کہ :-

”اسٹریٹجی نے اپنی بنی بنانے کے لئے یہ موجودہ زمین لے لی تھی اور یہاں ایک والی ملک سے بھی بڑھ کر خود مختاری سے بادشاہت کرتا تھا البتہ فرما تھا کہ سلاطین میں ہمدردی و انسانیت ہوتی ہے اور وہ اُنہیں مفقود تھی جب کبھی کوئی غریب ناواقف ہندوستانی اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا تو ”لڑو“ اسکو سخت سزا دے دیتا اور اس کے اس حکم کی تعمیل عموماً اُس وقت کی جاتی تھی جب وہ کہانے پر ہوتا تھا۔ کہانے کے کمرے کے پاس اس مجرم کی ”گریوزاری“ میں اسکو خوشگوار سرد و کامزا آنا تھا۔ اس جگہ کے آس پاس سب پر

آباد میں اور ان میں مردہ شوہر کے ساتھ بیوہ کا سنی ہو جانا مروج ہے مغلوں
 کی جنگ سے پہلے ایک مرتبہ مٹھ چٹا اپنے معمولی باوی گاڑ کے ساتھ ایک جوان
 بیوہ کو سنی ہونے کی درذناک رسم ادا کرتے ہوئے دیکھا جس کے حسن و جمال پر وہ
 ایسا فریفتہ ہو گیا کہ اُس نے اپنے پاہیوں کو حکم دیا کہ ان جلادوں سے اسے
 کو زبردستی چھین لے اور جی تعمیل میں وہ حسینہ و جمیلہ زبردستی اس کے بنگلہ میں پہنچاؤ
 گئی جہاں وہ دونوں بہت برسوں تک محبت کیا تھے رہے اور اس عورت سے
 کئی بچے بھی ہوئے۔ آخر کار مٹھ چٹا کے کلکتہ میں کونٹ پذیر ہونے کے بعد
 مر گئی۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ عورت
 ہو جاتی اس عورت نے خود مٹھ چٹا کو شہری کر لیا جس کے بعد مٹھ چٹا کی
 صرف اس قدر بات تو مسیحی عقیدے کے موافق دیکھنے میں آتی کہ اُس نے اپنی
 بیوی کو اچھوٹ کر دفن کر کے اس کی قبر پر ایک گنبد تعمیر کرا دیا اور جب تک زندہ رہا
 بت پرستوں کے دستور کے مطابق سال بھر ایک مرغ اس عورت کی قبر پر رنج
 کر کے اس کی برسی کرتا تھا۔ یہ واقعہ عام طور پر مشہور ہے اور مجھے معتبر ذرائع سے
 کو خیال ملی ہے۔ ہندو اور عیسائی جو بمقام کلکتہ چٹا کے قلعہ میں آباد تھے
 بیان تھا کہ یہ واقعہ بالکل سچ ہے۔

(جلد دوم صفحہ ۷۸)

کاٹھیاواڑ کے قریب جو کالونی یا نوآبادی انگریزوں
 نامی ایک شخص صاحب بیا کرتے ہیں کہ:-
 ریلوے کمپنی
 Harbour of کے جہاز انتظامی کے ممبر بہت سے معاملہ ان کی کامیابی
 چھوٹے۔ و سائزات

”کیا کرتے تھے گراں غیر شخصوں کے سامنے میں جو ان کے قابو میں جاتے ہیں“
 ”اور کیدل ہو جاتے ہیں“ کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہیں
 ”حب مرضی منافع کے ساتھ مال کی خرید و فروخت کریں بلکہ وہ مجبور ہیں کہ گورنر یا جلا
 ”کونسل اپنی مرضی اور عوامانہ قیمت متعین کر دیں یا بیع و شری کر میں بخ کے طور پر یہ ہو گیا
 ”اگرچہ شری سے خرید و فروخت کی اجازت گورنر سے حاصل کیے ہوگی یہ ایک ناقابل معافی جرم“
 ”وہ ایسا ہے کہ وہ ہو گلی جاکر مال کلینچ بھی دیتا کریں“ (جلد دوم صفحہ ۱۱۲ و ۱۱۳)
 ”اگر کبھی کوئی مال فروخت کر یا یا روپیہ قرض دیتا اور پھر چاہتا کہ تقاضا
 کرے تو بغیر ہتھکا پوٹھکار کے اسی جاں بری نہیں ہوتی۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۸)

اور یہ تو ایک بالکل معمولی بات تھی کہ فرنگی سیاح ہندوستانیوں کے قصوں
 کے جلسہ میں جب بدعوئے جاتے تھے تو وہ وہاں جا کر تہذیب اور شرم و حیا
 کو خیر باد کہہ کر طوائف سے ہونسا کی خواہشات کی تکمیل آزادی سے کرتے

(جلد اول صفحہ ۲۶۴)

یہاں تک بنگال کے انگریزی تجارتی اخلاقی حالت بنیاد کی اب بھی
 کا حال ہے۔ یہی کے مجلس انتظامی کا صدر نشین مسٹر جائلڈ *Mr. Child*
 نامی ایک شخص جس کا جس سے اور ایک شخص مسٹر کپتان *Captain* ہاربرڈن
Harbison سے لگاڑ تھی۔ صدر نشین مذکور نے اس کے خلاف
 جھوٹے اوتساویراتے اور جعلی کاغذات بنا کر اسکی سب جائداد ضبط کر لی اور
 اس کو جیل خانہ بھیجا۔ اس کپتان کی بیوی پیسے کو محتاج ہو گئی لیکن

دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی جلسا زیاں کی گئیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۹۵)

یہ مسٹر چائلڈ جو کمپنی کا جنرل سمجھا جاتا تھا ایک شخص مسمی *Buchanan* سے ناراض ہو گیا اور اس نے ایک بنے کو اس پر متعین کیا کہ کسی طرح سے مسٹر بوچر کو زندہ یا جائے۔ یہ بنیا مسٹر بوچر کے ہندوستانی باورچی سے ملایا اور مسٹر چائلڈ کا مطلب حاصل کرنے کے لئے اس کو روپیہ کا لالچ دیا۔ ہندو باورچی نے بنے سے تو وعدہ کر لیا مگر سفید شکمیا اور روپیوں کی پھیلی جو اس بنے نے اسکو دی تھی وہ اس نے اپنے مالک مسٹر بوچر کے سامنے لیجا رکھی۔

(کیٹان ملٹن جلد اول صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۷)

ایک شخص مسمی ٹیٹ (*Mr. Tit*) کو بحری قزاقوں گرفتار کر لیا تھا اور اس کا فدیہ یعنی زرِ مخلصی پانچ ہزار پونڈ قرار دیا تھا۔ مسٹر ٹیٹ نے سورت میں اپنے دوستوں کو روپیہ ادا کرنے کے لئے لکھا لیکن مسٹر چائلڈ نے کسی بنے کے زبانی قزاقوں کو کہلا بھیجا کہ مسٹر ٹیٹ کو زندہ مالدار آسامی ہے اس سے پچیس ہزار پونڈ لئے بغیر مت چھوڑنا اس زبانی نے زرِ مخلصی کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ یہ رقم مسٹر ٹیٹ ادا نہ کر سکا تو ان چھ مہینے میں یہ بحارہ قزاقوں کی قید میں رہ گیا۔ یہ قزاق مرگا گالیان دیتے تھے کہ اس نے ان کو ایسی بری صلاح دی کہ اس کا

(جلد اول صفحہ ۱۹۸) نیز ملازم رہتی تو پنی

بھی گئے۔ یہ حضرت وہی مسٹر چائلڈ ہیں جن کا تذکرہ باب شانزہ کی ماسوا میں

اوجین کو ڈاکٹر ٹرنس نے یہ ہدایت بھیجی تھی کہ ہندوستانی تاجروں کو خوب رویہ
 ایشیہ کر جہاز ولایت کو روانہ کرو اور جنگ کی چھڑ چھاڑ کرو۔ انہیں حضرت نے
 (۳۵) دفعات کی شکایتی درخواست گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی جس کا
 نتیجہ بھی باب ہشتم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اب دوسرے گورنر صاحب کے حالات
 جس زمانہ میں سر جان گر (Sir John Gayer) بمبئی میں ایسٹ
 انڈیا کمپنی کی طرف سے گورنر تھے اُن دنوں ایک شخص اپنی چھارہ سالہ
 بیوی کو بمبئی میں چھوڑ کر کسی کام کے لئے چین گیا ہوا تھا۔ گورنر نے اس عورت
 کی شادی اپنے لڑکے سے کر دی اور سابقہ شادی محض اس بنا پر کالعدم قرار
 دیدی کہ بمبئی میں ان کے قانون نافذہ کی رو سے شادی کی توثیق کے لئے
 گورنر کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے جو اس شادی میں جب قاعدہ نہیں
 حاصل کی گئی۔

(کپتان ہلٹن جلد اول صفحہ ۲۳۵)
 کپتان ہلٹن کو اس گورنر کی نسبت یہ شبہ تھا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے
 کو اور اپنی بیوی کو عہدہ کسی نہ کسی طرح سے گورنر سورت کا قیدی بنایا اور
 اس میں اس کی مصلحت تھی کہ سورت میں قیام کرنے کا اس کو موقع ملے
 پھر وہاں دیرہ اپنا ذاتی سرمایہ کسی تجارت میں اچھی طرح لگا سکے۔

(کپتان ہلٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

سر جان کے بارے میں کولس و بیٹ صاحب (Sir Nicholas Witte)
 گورنر ہندوستان نے یہ ایسا مہرہ پیش کیا تھا کہ خود کمپنی کے ملازموں نے اس کو پکڑ کر

حیثیت ایک قیدی کے انگلستان روانہ کر دیا۔

(کپتان ملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

یہ حالت تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی سب سے زیادہ مہذبہ سمندر کی بابت کپتان جیسا تحریر فرماتے ہیں کہ ہی یورپین تاجروں کے اوقات دریا کی ڈاکو بھی بن جاتا کرتے تھے اور بڑے بڑے شہر ڈاکو یا کرتے تھے سورت کے حالات تحریر کرتے ہوئے کپتان موصوف لکھتے ہیں:۔

”۱۹۹۵ء میں کپتان ایوری ایک بحری قزاق نے اس شہر کی تجارت و امن میں خلل ڈالا اور چار چھوٹے جہازوں سے حملہ کر کے دولت مغلیہ کا ایک جہاز لو لیا جس سے بہت سارا سونا چاندی اور ایک مسلمان خاتون لوٹا میرا جس کے ہاتھ آئی جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں بحرا بحر و میدا کا سر تحریر کر چکا ہوں اس وقت اس شہر کی تجارت کو بہت حد سے پہنچے ہیں“

(جلد اول صفحہ ۱۳۶)

عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے عام حالات کی بابت کپتان جیسا تحریر فرماتے ہیں کہ اس کمپنی کے عمال کے ہاتھوں اس قدر ظلم و ستم ہوتا تھا کہ نہ کسی سانی کتاب میں اور نہ کسی انسانی قانون میں اتنی ظالمت تھی کہ وہ ان لوگوں کو ان زیادتیوں سے باز رکھتا۔

(جلد دوم صفحہ ۱۸۰)

جب کہ یہ رعایا مغلیہ انگریزوں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھتی تھی کے عہدہ دار یہ کہہ کر کہ تمہاری تنخواہیں بہت زیادہ ہیں جبراً ان کی مالک ہو گئیں

آدھا سا بچھا کر لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۳۴)

یہاں تک تو ایٹ انڈیا کمپنی کے تجارت کی عام اخلاقی حالت بیان کی گئی مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اخلاقی حیثیت سے پورا آؤ کا آؤا گزرا ہوا تھا۔ جو لوگ کہ ان تاجروں کی اخلاقی حالت درست کر سکتے تھے ہر جگہ کچھ اثر تھا وہ پادری صاحب کا طبقہ ہو سکتا تھا لیکن کیا ان پہلے جنابی کے اس طبقہ کی بابت یہ بتی کہ جہاں کہیں ان کے قدم پہنچتے تھے وہاں شراب خانے اور عیاشی کے اطوار بھی ساتھ ساتھ چلتے تھے اور وہ لوگ جو ابھی تک سائن باؤں سے پرہیز کیا کرتے تھے انکو بھی ان بدعات سے بچنا بہت دشوار ہو جاتا تھا۔

(جلد دوم صفحہ ۸۵ و ۸۶)

بصرہ کی تو یہ حالت تھی کہ علانیہ گرجوں میں شراب فروخت کرتے تھے اور جو رعایت گورنمنٹ ان کے ساتھ مرعی رکھتی تھی اس سے یہ بدترین اور ذلیل ترین فائدے اٹھاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۸۲)

گو کہ مشنریز کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی شخص ایک نرالی خیر مشلا چھلے وغیرہ بازار سے خریدے اور پادری صاحب کو دینے سے انکار کر دے تو وہ اس کو مہرہ قرار دیکر ذات سے باہر کر دیتے تھے۔ اور پھر بغیر سیات پو لئے شریک نہ کرتے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

لوگوں کو طح طح کی باز گیری و افسوں گرمی کے کرتب کھا کر اپنا
معتقد بنا لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

اگر کوئی شخص گناہوں کی نجات حاصل کرنا چاہے تو وہ اُسکو بہت سی
سے خرید سکتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۲۴)

منگلور میں بعض ایسے بے چارے تھے کہ اگر کچھ روپیہ ملتا ہو تو مسافروں
کے واسطے عورتیں مہیا کرنے میں بھی اُن کو کچھ غار نہ تھا۔ اور ان کا خیال
یہ ہے کہ اگر کچھ فائدہ ہوتا ہو تو چوری۔ قتل۔ یا زنا کوئی گناہ نہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۸۲)

انہیں کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا کے ریاکاروں کے
طبقہ سے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۲۷ - ۲۴۷)

ہم کو ان واقعات کے بیان کرنے میں تکلیف معلوم ہو رہی، لیکن ہم
اس تفصیل کیساتھ مثالیں پیش کرنے کے لئے اس لئے مجبور تھے کہ اگر صرف دو
ایک واقعات بیان کئے جاتے تو ناظرین کو شاید یہ خیال پیدا ہو سکتا
تھا کہ بد اخلاقی کی مثالیں ہر قوم اور ہر زمانہ میں پائی جاتی ہیں لیکن جب جائے
وہ تھی کہ جس کا بیان کیا گیا تو پھر اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو
ڈپلومیسی اس ملک کے فتح کرنے میں بالآخر کامیاب ثابت ہوئی اس میں اصل

انصاف یا عمدہ اخلاق انسانی کو ابتداء میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ دلوں میں
 بغیر ان اوصاف کی ابتداء کے کامیاب ہوئی۔ میں نے لفظ "ابتداء" عمداً استعمال
 کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ان واقعات کو انگلستان
 اُن ناک نفسوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جنہوں نے ایٹ انڈیا کمپنی کے
 خلم و تعدی کا مسئلہ پارلیمنٹ اور اپنی قوم کے روبرو خود ہی پیش کر دیا یا
 جو ایکٹ انڈیا کمپنی کے دور کے بعد جب ہندوستانی سلطنت مٹ چکی تھی
 اور انگریزی حکومت مستحکم ہو گئی تھی۔ ہندوستان کو بعض حکومت بھیجے گئے
 اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ظلم و تعدی کے رفع کرنے میں اور انصاف کے
 قائم کرنے میں کوشش کی۔ میں ظلم و تعدی کے ان واقعات کی نقل نہ کرتا
 لیکن کہی ملک کی تاریخ میں ایسے بڑے بڑے واقعات جن کا ذکر کیا گیا لیکن
 کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ قوموں اور ان کی سلطنت کی زندگی و موت
 کے متعلق جو اصول قانون قدرت نے بنائے ہیں وہ صحیح طور سے اخذ کیے
 جائیں یا یوں کہئے کہ صحیح فلسفہ تاریخ تیار کیا جاسکے اور یہ ثابت کیا جاسکے
 کہ کس طرح سے بدترین اخلاق انسانی بھی بعض صورتوں میں کامیاب ہوئے ہیں
 گو کہ انکا انجام کچھ ہی ہو۔

باب دہم ہندو سائنس کا نقطہ نظر اور انہیں اٹھانے کی تدبیر

مضمون باب دہم | پہلے نو باب دراصل اس خاتمہ کے باب کی تہذیبیں۔ اصل مقصود اسی باب کا لکھنا تھا۔ اس سے قبل کے ابواب میں صرف وہ مواد جمع کرنا منظور تھا جس سے ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے جس کا اظہار اس باب میں کیا جائیگا۔ باب ہذا میں تین امور پر غور کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ ہندو براہمنوں کو عہد مغلیہ کس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے؟ دوم یہ کہ مسلمانوں کو ہندو کس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے؟ اور تیسرا یہ ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی بہترین تدبیر میری رائے میں کیا ہے؟

حصہ اول: ہندو کا نقطہ نظر

خلاصہ کی ابتدا | قبل اسکے کہ میں اہل ہندو کے صحیح نقطہ نظر کے متعلق زبان کھولوں مجھ کو ناظرین معاف فرمائیں گے۔ اگر اس خاتمہ کے باب میں مختصراً ان واقعات کا اعادہ کر دوں جنہے ثابت کرنے کی کوشش پہلے ابواب میں کی گئی ہے کیونکہ دراصل انہیں واقعات کی مدد اہل ہندو کے صحیح نقطہ نظر کی بنا

رائے قائم کیا سکی۔ پھلے ابواب میں عہد اورنگ زیب کے ہندوستان کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے دو وجوہ تھے ایک تو یہ کہ عہد مغلیہ کے دور کا حقیقت یہ آخری بادشاہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عہد مغلیہ کا مقصد ترین مسلمان بادشاہ خیال کیا جاتا ہے۔

تسلیم | باب دوم میں کہا یا گیا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں صرف ایک ہی شہر ”ٹٹہ“ میں مسلمانوں کی گزری سیاح نے چار سو درگاہیں گھسیں اور وہ اس حثیت کی تھیں اور وہ انکو اسی شان کی نظر آئیں جن کو وہ کالج کہتے ہیں کیا دنیا کا کوئی دوسرا حصہ شاعتِ تعلیم میں اس زیادہ اس وقت مصروف تھا۔ ؟

مذہبی رواداری | باب سوم میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں اس ملک کی مذہبی رواداری و بے تشبی کی یہ حالت تھی کہ ایک انگریز سیاح کو مذہب کے اعتبار سے ہندو مسلمانوں میں امتیاز دشوار ہو گیا تھا۔ آج بھی ہندوستان میں لاکھوں روپے کی ایسی جاگیریں موجود ہیں جو شاہانِ مغلیہ نے مندروں کی امداد کے لئے عطا کی تھیں خود اورنگ زیب کے متعلق جبکو بڑا مقصد کہا گیا ہے ابھی چند دن پہلے ایک واقفِ حال مسلمان نے ہندو مسلمانوں کے بھرے مجمع میں یہ بیان کیا کہ صرف بنارس میرے ساتھ چلے چلو تھیں وہاں کے پجاریوں سے اتنی اسناد نکلوا کے دکھاؤ گے کہ ان میں سے قریب قریب سب اسی بادشاہ کی عطیہ میں دیائیں کو بھی گرجے بنانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اب ذرا اس زمانہ کی یورپ کی تاریخ پڑھئے

اور وہاں کی مذہبی خونریزیوں سے ہند کی حالت کا مقابلہ کیجئے اُس وقت معلوم ہوگا کہ مذہبی رواداری کے معاملہ میں عہد مغلیہ نے اِس ملک کو کہاں تیار کیا تھا۔

تجارت و فلاح البالی | جامع میں ہند کی تجارت و فلاح البالی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ صرف ایک شخص عبدالغفار کا سرمایہ تجارت انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمایہ تجارت کے برابر تھا اور صرف احمد آباد و سورت کے تجارتی محصول کی آمدنی اس قدر تھی کہ اُس مانہ کے انگریز سوداگر و سیاح کو بے اختیار شک ہوا۔ اِس زمانہ میں شائے یا محتاج کا نرخ بھی بتایا جا چکا ہے۔ تجارت، دولت اور فلاح البالی کے اعتبار سے اُس زمانہ کی دنیا کے کسی ملک کا مقابلہ ہند سے کر لیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ عہد مغلیہ میں تجارت کو کہاں تک فروغ حاصل تھا۔

انصاف و امن و امان | باب پنجم میں انصاف و امن و امان کے ضمن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک انگریز کی جسے عہد اورنگ زیب میں دیکھا گیا تھا اس کے مختلف حصوں میں سفر کیا تھا اور وہاں کے حالات کو بغور کا مل دیکھا تھا۔ یہ کہ مسافر نے جو جان و مال کے کچھ خطرے کے تمام ہندوستان میں اس وقت آسانی سے سفر کر سکتے تھے واک کا یہ انتظام تھا کہ ہند کے دور و دراز مقامات سے دہلی تک خط پہنچنے میں صرف آٹھ روز صرف ہوتے تھے آپ خلیہ فرما سکتے ہیں کہ ایسا انتظام قائم رکھنے کے لئے نقل و حمل سڑکوں اور راستوں کی حفاظت کے کیا کیا نہ انتظامات ہوں گے۔

صنعت و حرفت | اب صنعت و حرفت کے شعبہ کو دیکھئے۔ عہد مغلیہ نے ہند میں یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ صرف ایک شہر کے کارخانے ہیں سچاس ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے۔ یہ قصے کہانی نہیں ہیں تاریخی واقعات ہیں المختصر یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی معنی شہادت کا حوالہ دیا گیا ہے ۱۹۲۲ء میں جو بڑی نمائش دولتِ برطانیہ کے تمام ممالک کی ہوئی ہے اس میں ہندوستان کے سیکشن یعنی حصے میں مجھ کو ہندوستان کی مصنوعات میں سے کوئی ایک بھی ایسی چیز نہ دکھائی دی جو عہد مغلیہ میں نہ بنتی ہو یا جسکا بنانا عہد مغلیہ کے بعد اس ملک نے گزشتہ صدی میں سیکھا ہو۔ ان تمام واقعات اور امور کے متعلق باب ششم ملاحظہ فرمائے۔

یورپین تجارت سے | اگر ناظرین کو یہ معلوم کرنا ہے کہ اس ملک کی تجارت و تمول کے اورنگ زیب کا بڑاؤ بڑانے میں اور ایشیا و یورپ کو یکجا ملا دینے میں عہد مغلیہ میں کیا کیا کوششیں لگیں ہیں تو ذرا عہد اورنگ زیب کے وہ حالات جن کی دستاویزی شہادت آج موجود ہے باب ششم میں ملاحظہ فرمائیں اسی باب میں اگر زبانی کمپنی کی اصلی خط و کتابت اورنگ زیب کے اصلی فرمان کی نقل کی گئی ہے۔ یورپین تجارت کی کمزوری | اگر ناظرین کو ان مشکلات کا اندازہ کرنا ہے جنہیں عہد مغلیہ کا آخری دور بھنسا ہوا تھا اور اگر اپنے ملک کے عہدہ داروں کے عادات و اطوار کا مقابلہ ان لوگوں کے کیر کڑ سے کرنا منظور ہے حتیٰ ڈپلوسی (حکمت عملی) اور تدبیر نے سلطنتِ مغلیہ کی تیخ کنی کی تو باب نہم پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ خلاصہ ہے ان واقعات کا جن کا تذکرہ پچھلے ابواب میں کیا

جا چکا ہے۔

کل ہند کو ایک میاں | اب ان تمام کوششوں کا مجموعی اثر ہندوستان پر کیا ہوا
سلطنت بنا دیا | میرا خیال ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ بالآخر

کل ہندوستان ایک ملک ہو جائے۔ اُس کا ایک تمدن ہو جائے اُس کے
بڑے بڑے پہاڑ اور دریا اسکے باشندوں کو جدانہ کر سکیں تو اُس کی بنیاد
قادر مطلق نے شاہانِ مغلیہ کے ہاتھوں سے ڈلوائی تھی اور اسکے فخر کا سہرا
اورنگ زیب ہی کے سر پر زیب دیا ہے کہ اسی بادشاہ اورنگ زیب کے آخری
عہد میں ہند نے ایک متحدہ سلطنت و امپائر کی صورت اختیار کر لی تھی مغربی
ہند، مشرقی ہند سے اور شمالی ہند جنوبی ہند سے مل گیا تھا اُسکے باشندے
بہت کچھ خلط ملط ہو چکے تھے۔ تمام ہند مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر ایک تخت
دہلی سے اسطرح وابستہ ہو گیا تھا کہ گویا سارا ہندوستان ایک ہی ملک ہے۔
صوبوں کی قریب قریب اسی تقسیم ہند پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔

توانین بنائے | آج ٹرین انڈیا میں جو قانون مل و صول مالگزاری رائج ہے
اُنکی نسبت کیا کہی کو انکار ہے کہ اسکا ڈاکچہ شہنشاہ

اکبر کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ ہمارا موجودہ حکمرانوں کو سلطنت کے ڈرائن
(reign) و نمونہ کے بنانے کی رحمت ہی نہیں برداشت کرنی پڑی بلکہ
اُن کو بنی بنائی تیار عمارت ملگنی۔ البتہ حسب ضرورت وہ اس میں ترمیم و تغیر
و تبدل کرتے رہے ہیں اور مور زمانہ اور رعایا کے تبدیلی خیالات کیا تہذیب
کرتی رہی پڑی جیسا کہ ہر سلطنت کو کرنا پڑتا ہے سلطنت میں نصفت و عدالت

و قانون شہادت و دیگر علوم سائنس کے وہ اصول جن سے اس کے فاتح عرب و یورپ کو مستفیض کیا تھا ہندوستان میں ان کے رائج کرنے والے عہد غلیہ کے حکمران تھے۔

ہند کا قدیم تمدن ہم کو اس ملک کے تمدن سے ایک خاص اُس سے اُس نے نہ صرف

روحانی تعلیم اور ترقی کے بہتے مدراج طے کئے تھے بلکہ فن

حکمرانی میں بھی قدیم دنیا میں ایک خاص امتیازی رتبہ حاصل کیا تھا۔ ہماری را

میں اس ملک کے لئے عرصہ تک وہی تمدن منوروں تھا مگر ہم یہ کہنے کے لئے

تیار نہیں ہیں کہ وہ تمدن ہند کی معراج ترقی کا آخری زینہ تھا۔ انسانوں کو

بلحاظ اس کے پیشہ کے مختلف طبقات میں تقسیم کر دینا اور پھر ان میں طرز معاشرت

کی ایسی آہنی دیواریں بنانا کہ آپس میں شادی بیاہ نہ کرنا، دنیا تو درکنار

محض چھو جانا بھی بعض اوقات معصیت میں شمار ہو یا حصول علم کے حق کو ان لو

گوں کے مخصوص طبقہ یعنی برہمنوں میں محدود کر دینا یا غیر مذہب کے افراد سے امتیاز

و مغایرت برتنا یا تجارت و تحصیل علم کے لئے ممالک غیر میں سفر کرنے سے احتراز

کرنا۔ یا صرف یہی نہیں کہ چودہ پندرہ برس کی بویہ کی شادی نہ کرنا بلکہ اس کو

تسی کر دینا اور اسی قسم کے تمام روایات و رواج جو ہند کے قدیم تمدن میں رائج

ہو گئے تھے سوسائٹی (Society) کی اس حالت کے اعتبار سے جیسا کہ

بطور آریہ قوم کے ابتداء اس ملک میں آئے تھے شاید ضروری و لازمی ہونگے

لیکن آج یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ تمدن اپنی نوعیت میں ایسا تھا کہ ہندوستان

کی روز افزوں ترقی کیساتھ دائماً قائم رہ سکتا تھا۔

قدیمی تمدن میں ضروری
لوچ پیدا کر دیا

جس قسم تمدن کا ذکر کیا جا رہا ہے ممکن ہے کہ وہ ویدانت کی
تعلیم نہ ہو مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ تمدن ہند میں قائم ہو گیا
تھا۔ میری رائے میں اس تمدن میں جو ضروری تبدیلیاں آج سرعت کیساتھ
ہو رہی ہیں انہی ابتدا کرنے کا سہرا بھی عہدِ مغلیہ کے سر پر ہوتا نظر آتا ہے جب
اس ملک میں آئے وہ بھی یہاں اسی طرح بس گئے جیسے آریہ زمانہ کے اہل ہندو آباد
ہو گئے تھے لیکن یہ اپنے ساتھ ایک دوسرا تمدن لائے جس کا خمیر انہوں نے
اہل ہندو کے قدیم تمدن میں شریک کر دیا۔ جس تمدن کی رُو سے کسی زمانہ میں
ایک مسلمان کو ہندو کا چھونا تو دور کنار ایک ہی ہندو مذہب کے بعض فرقے ایک
دوسرے کو نہیں چھو سکتے تھے۔ اس میں مسلمانوں نے یہاں اگر تغیر پیدا کرنا شروع
کیا۔ اور عہدِ مغلیہ میں بالآخر عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے
کے پڑوسی بن کر ایک ہی دیوار کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ہند کے کل پچیس
ایک طرح پر لانے کی عملی ابتدا اسی عہدِ مغلیہ سے ہوئی تھی۔ اسی عہدِ مغلیہ میں تحصیل
علم کے حق کا دائرہ وسیع کیا گیا اور کایا تہوں کا شمار اہل قلم میں ہو گیا چھوٹ
کے رواج کے متعلق مہاتما گاندھی اور دیگر رہبران قوم کی تعلیم آج یہ ہے کہ وہ
رواج اس ملک کی ترقی کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ لیکن اس سبق کی الف باب
اہل ہند کو عہدِ مغلیہ ہی سے پڑنا شروع کر دینی تھی ہر نئے رواج فیشن کی ابتدا
کسی سوسائٹی کی چوٹی سے ہوا کرتی ہے لہذا اکبر بادشاہ نے سنی کے قدیم رواج
کو زبردستی موقوف کر کے ہندو مسلمانوں میں شادی کا رواج بھی قائم کرنا چاہا تھا
اور اس کی ابتدا خود ہی کی۔ اصلیت یہ ہے کہ ہند کے قدیم سخت تمدن میں جو لوچ

آج نظر آرہا ہے اور جبکی وجہ سے ہندو جدید تمدن کی روز افزا قوتوں ترقی کا بار برداشت کر سکتا ہے وہ لوح عہد مغلیہ ہی سے برابر پیدا کیا جا رہا ہے تبسہ کہیں یہ موجودہ حالت رونما ہوئی ہے۔ اس لوح کے پیدا کرتے میں اب ان موانع اور زحمتوں کا سامنا نہیں رہا جو ابتدائیں مسلمانوں کو اس وقت پیش آتے تھے۔ برداشت کرنی پڑیں جبکہ انہوں نے ہندوؤں کی دیوار سے اپنی دیوار ملا کر رہنا شروع کیا تھا۔

بڑے بڑے شہر بنائے | اس عہد مغلیہ میں سرزمین ہند پر تے بڑے بڑے شہر آباد کئے گئے کہ جب لارڈ کلايو (Lord Clive) یا لارڈ وارن ہیسٹنگز (Lord Warren Hastings) (دونوں میں سے کوئی ایک جس کا پورا خیال مجھے کو اس وقت نہیں آتا) شہر ڈھاکہ میں داخل ہوئے اور وہاں کی آبادی و تجارت کو دیکھا تو یہ کہا کہ لندن و ڈھاکہ میں صرف اس قدر فرق ہے کہ ڈھاکہ کی تجارت لندن کی تجارت سے کہیں زیادہ ہے اُن بڑے شہروں میں سے بعض بعض آج بہت ہی پست حالت میں ہیں مثلاً شہر ٹمہ جو نہ کا ایک زبردست شہر تھا جہاں چار سو درگاہیں تھیں وہ محض ایک چھوٹا سا قصبہ اب رہ گیا ہے یا شہر شادی آباد مند و جبکہ خوشنما کہندہ علاقہ ریاست دہلی میں آج اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا اظہار زبان حال سے کر رہے ہیں ایک جڑا ہوا لگاؤں ہے۔

عمدہ عمارتیں بنائیں | سرسینک آرٹ Sara cenic Art کی کسی کسی خوبصورت خوبصورت محراب دار رنگ مرمر کی عمارتیں وسیع سڑکیں۔

کاروانسٹریٹس، کیسے کیسے باغات، آبرسانی کے عجیب و غریب ذرائع اور تالاب بنانا کر سہریہ بیچ کو خوشنما و آراستہ کرنے کی کوشش اسی عہد مغلیہ میں کی گئی۔

دریائے تجارت بڑھا
ہند کے بڑے بڑے دریاؤں سے تجارت و آماشی کا کام لیا گیا۔ جو تجارتی جہازان دریاؤں میں دوڑا کرتے تھے

انکا کچھ تذکرہ باب چہارم میں کیا جا چکا ہے۔

پہاڑوں کو فروز میں بنایا
زمین اور دریا کا ذکر ہو چکا اب اگر ناظرین کو اس کا اندازہ کرنا ہے کہ عہد مغلیہ نے بنی نوع انسان کی راحت و آرام کشمیر کے حالات

میں اضافہ کرنے کے لئے پہاڑوں کو کس طرح زیر و زبر کیا اور ان جنگلوں کو جہاں شیر، چیتے، بیکھ، وغیرہ درندے رہا کرتے تھے۔ کاٹ کاٹ کر کسی کسی نئی بستیاں آباد کیں تو عالم تصور میں شیر ساتھ کشمیر کی جانب رخ کریں اور جموں سے لیکر سرنگپور تک ڈیڑھ سو مل کی قید شاہی سڑک پر سفر کریں۔ راستے میں ویری ناگ۔ چل۔ اسلام آباد اور دوسرے آس پاس کے مقامات پر عہد مغلیہ کے تمدن کے آثار زیرِ رائے میں تو حماموں کی دبی ہوئی ٹونٹیوں میں اور بالائے زمین پرانے باغات ٹوٹے پھوٹے فواروں اور کہیں کہیں بڑے بڑے واٹر ورکس کی صورت میں دیکھتے چلیں۔ سرنگپور پہنچنے سے قبل راستے میں اس عفران زار کی بھی سیر کر لیں جسکی جڑیں سرزمین ہند کو معطر کرنے کے لئے ایران سے لائی گئی تھیں اور اوچن کو دیکھنے کے لئے آج بھی دور دور سے سیاح جایا کرتے ہیں۔ سرنگپور

پہونچ کر پہلے اس نسیم باغ کو دیکھیں جہاں صدیوں کے پرانے خیار کے عظیم الشان
 و نماور درخت کھڑے ہوئے اپنے ایرانی نسل ہونے کا اظہار کر رہے ہیں
 یہ خیار کا درخت جسر وادی کشمیر کو آج اس قدر فخر اور ناز ہے بلکہ وہ عزیز
 ہے کہ وہاں کے قانون کے بہ موجب اس کی شاخ کاٹنا بھی جرم ہے عہد مغلیہ
 ہی میں ایران سے لاکر ہاں لگایا گیا تھا۔

کشمیر کا قدیم کالج و دارالافتاء اس نسیم باغ میں مشرق رو کھڑے ہونے سے آپ کی نظر
 بار بار دو دروازے پر پڑے گی جو پڑی پڑی گلیوں پر ایک
 عالی شان تختہ ویران عمارت دکھائی دے رہی ہے راستوں کے نشانات
 بھی نظر آئینگے۔ گرواں کسی آدم زاد کی صورت نہ دکھائی دیگی۔ منظر و کفر
 عمارت بہت بڑی لیکن ویران اور ہوکا عالم ہے۔ اسکے آس پاس بھی
 کوئی مکان نظر نہ آئیگا۔ ناظرین کا جی چاہیگا کہ اس کو قریب سے ایک نظر
 دیکھیں۔ لیکن کشتی کا کشمیری بائو (ملاح) یہ مشورہ دیکھا کہ وہاں نہ
 جائیے۔ وہاں جنات ہیں، بڑے بڑے زہریلے سانپ اور اژدہا ہر
 طاق و گوشہ میں پڑے سو رہے ہیں اور شیروں کا سکڑ ہے ناظرین متحیر
 ہو کر دریافت کریں گے کہ آخر یہ عمارت کس غرض سے بنائی گئی تھی۔ زیادہ دیر
 سے معلوم ہو گا کہ یہ وہ کالج ہے جس میں پڑھنے کے لئے عہد مغلیہ میں دور و دراز
 کے سفر طے کر کے طلباء آیا کرتے تھے۔ اور جو محرابیں نیچے نظر آرہی ہیں وہ
 طلباء کا دارالاقامہ و بورڈنگ ہوس تھا۔ گہنا جنگل کاٹ کر وہ پہاڑ طلباء
 آباد کیا گیا تھا۔ ابھی تو اس سنان عمارت کی خاموش دیواریں عہد مغلیہ

کی کوششوں اور تمدن کے نشانات کا کام ہے رہی ہیں اور زبان حال اپنے
 بانیوں کی عظمت و جلال کا قصیدہ اور اپنی تباہی و بربادی کا مہرہ پڑ رہی
 ہیں مگر کچھ برسوں کے بعد وہ دیواریں بھی جب مسمار ہو جائیں گی اسوقت میری
 اس کتاب کے پڑھنے والے شاید یہ کہیں گے کہ یہ شخص معلوم کس عمارت کا ذکر
 کر گیا۔

چشمہ شاہی جس پہاڑ پر یہ عمارت ہے اُسی کے نیچے سرنگری کا وہ مشہور و معروف
 چشمہ شاہی ہے جسکو شاہان مغلیہ نے ایک خوبصورت عمارت کی
 آغوش میں محفوظ کر کے ایک فوارے کی صورت میں مبدل کر دیا ہے۔ عہدِ غلیہ
 میں کشمیر کے چشموں کی حفاظت اور قدرومنزلت کا یہ ایک نمونہ مشتے از
 خروارے ہے۔

نشاط باغ و شعلہ ماہ باغ | اس مقام سے دو تین میل کے فاصلہ پر عہدِ غلیہ کے وہ باغ
 ہیں جن کو عوام الناس نشاط باغ و شالامار (در اصل شعلہ ماہ) تھا
 کہتے ہیں۔ بہت زمانہ ہوا مجھے سرنگری کے ڈائریکٹر (Director) صاحب
 زراعت نے جنے چارج میں وہ باغات تھے یہ بیان کیا تھا کہ جب لارڈ مینٹو
 وائسرائے ہند کشمیر شریف لینگے تھے تو انہوں نے عہدِ غلیہ کے یہ باغات دیکھنے
 کا اشتیاق ظاہر فرمایا تھا۔ اسوقت یہ باغات بہت اتر حالت میں تھے اسلئے
 کچھ روپیہ صرف کر کے انکی درستی کرائی پر بھیجا گیا کچھ سے انکو گزرا پڑا تھا
 اب تو پیسے انکو دیکھا کہ اچھی حالت میں ہیں مگر انکے پرانے درود و انوار
 اور درختوں سے انکے اصلی حسن کی صرف جھلک دکھائی دے رہی تھی کیونکہ اب

نیا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے جن ڈائرکٹر صاحب زراعت کا میں نے
 نوکر کیا وہ ولایت کے تعلیم یافتہ اور فن زراعت کے ماہر تھے وہ فرماتے تھے
 کہ اب ایسے باغات کا بنانا تو درکنار انکا قائم رکھنا بھی دشوار ہے۔ ناظرین
 کے قیمتی وقت ضایع ہونے کا خوف میرے دل پر طاری ہے مگر میں عہد
 مغلیہ کے کشمیری باغات میں داخل ہو رہا ہوں اگر اچھے بیان کرنے میں ذرا
 طوالت ہو جائے تو معاف فرمائیں۔ ناظرین کے ذہن میں اگر ایسے ایک
 باغ کی بھی صورت آجائے تو وہ حضرات جنہوں نے کشمیر میں دیکھا ہے
 اُن تمام باغات کا تصور کر سکتے ہیں جن سے عہد مغلیہ میں وادی کشمیر اس طرح
 آراستہ و پیراستہ کی گئی تھی جیسے کسی دہن کو کوئی کامل مشاطہ بناؤ سنگھار
 سے سنوارتی ہے۔ نشاط باغ و شالامار باغ میں داخل ہوتے وقت سب سے
 پہلے انکا پرانا پہاٹک، نقار خانہ، زینہ اور دیواریں خاموشی سے اپنے
 تعمیر کردہ نیوالوں کی شان و شکوہ اور فراخ حوصلگی کی نسبت سرگوشی کر بیٹھی
 مگر سنے باغ کا نظارہ اتنا موقع نہ دیکھا کہ اس طرف توجہ کئے اس منظر کا
 سماں یہ ہے کہ ایک پہاڑ کو چوٹی سے لیکر نیچے ٹک تک اس طرح تراشے چلے
 آئے ہیں کہ انہیں زینوں کی کیفیت و صورت پیدا ہو گئی ہے۔ ہر زینہ
 نہایت وسیع اور بہت لمبا چوڑا ہے جس پر ایک خاص ڈسنگ سے
 چمن بندی کی گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہاڑ پر اسکی چوٹی سے
 دامن تک باغوں کے زینے بنا دئے ہیں۔ ان زینہ نما باغات کے وسط
 میں اوپر سے نیچے تک چار پانچ گز چوڑی پانی کی چادر ماہی پست تراشے ہوئے

پتھروں سے گزرتی ہوئی ہر زینے پر اس طرح گر رہی ہے گویا سب مچل کے فرش پر صاف و شفاف جالی کی سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ ہر زینے پر جہاں یہ چادر گرتی ہے ایک حوض ہے جو اس پانی کو پہلے اپنے آغوش میں لیتا اور پھر گویا فرط نشاط سے اسکو گھٹاتا، نچاتا، اور اڑاتا ہوا بارہ بارہ پندرہ پندرہ فٹ اونچا آسمان کی طرف اچھاٹتا ہے۔ یہی اُس باغ کے فوارے ہیں۔ پھر یہ بہتا ہوا پانی دوسری چادر بنا اس سے نیچے والے زینے کے حوض میں گرتا ہے اور اسی قسم کی اٹھ کھیلوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ اوپر تھا۔ چونکہ پانی برابر رواں ہے اسلئے اوپر سے نیچے تک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاف پانی کی تمام چادریں اور فوارے ایک ہی ساتھ اوپر سے رقص کرتے ہوئے نیچے چلے آ رہے ہیں اور بالآخر سب نیچے والے حوض سے گزر کر خدا حافظ کہتے ہوئے اُس خوبصورت وسیع ڈالچھل میں گر کر غائب ہو جاتے ہیں جو دامن کوہ میں ان کو اپنی آغوش میں لیتے کے لئے منتظر کھڑی ہے۔ پانی کی اس چادر کے گرنے کی سُری آواز اور رقص حوض کے فواروں کی گنگناہٹ کشمیر کے اُن خوبصورت رنگ برنگ خوشحال طیور کو لاگ سُر کا کام دیتی ہے جو اُس پاس کئے خوشنما خوشبودار درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے چہماتے ہیں اور بعض تو من و عن واقعی گاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں زلفا طباغ و شالامار باغ کا یہ پہلا سماں دیکھ کر یہ ہے کہ ناظرین کی زبان پر کسی اگلے شاعر کا یہ شعر ہے

اگر فردوس بر روئے زمین است
 بہمن است و بہمن است و بہمن است
 بے اختیار آجائے اور وہ اسکی واقعیت کی صدق دل سے تصدیق کریں
 اب ناظرین بناغات میں تپتے ہوئے زمین بہ زمین پہاڑ کی چوٹی تک قدم نہ بڑھائیں
 اگرچہ راہ میں ہر محسن اور اسکی ہر کمکاری آنکھوں کو ایسی مرغوب ہوگی کہ ہر قدم
 پر قدم بڑھانے کو جی نہ چاہیگا اور ے

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگریم
 کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجات ہے
 کی کیفیت ہوگی۔ مگر اس موقع پر ہم کو توصف عہد مغلیہ کا تمدن دکھانا ناظر
 اسلئے ہم نئے پھولوں پر نظر بھی نہیں ڈالتے بلکہ جلدی سے چوٹی کے باغ
 پر پہنچتے ہیں۔ یہاں پہلے اس کنجی کے انتظام کو دیکھیے جو تین سو برس قبل
 اسطرح بنائی گئی تھی ایک جنرل سے باغ کے تمام فوارے اور چادریں آنا فائیں
 بند ہو سکتی ہیں اور دوسری جنرل سے پھر رواں ہو سکتی ہیں یہ ایسی حکمت تھی جس سے
 پہاڑ کی چوٹی پر پانی کے قدرتی چشمہ کو قابو میں کر لیا گیا تھا۔ اسکے بعد کچھ
 اور سرگاہوں کے نشانات و آثار پر نظر ڈالتے ہوئے پرانے سایہ دار حیرت نما
 حصار کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا لطف اٹھاتے ہوئے ان تلی تلی
 سڑکوں پر (جو ایک بڑے حوض کو اقلیدس کی مستطیل مربع شکلوں میں کاٹ کر
 اسکے اندر بنائی گئی تھیں اور جنہیں شفاف پانی کے فوارے ہر جانب طرچ
 کے قطر کا سماں دکھا رہے ہیں) چہل قدمی کیجئے۔ بالآخر اس چھوٹی سی

عمارت میں جو وسط حوض میں بنی ہوئی ہے اور جو اپنے محرابوں چھتوں اور
 مینا کاری کے کام سے سرسینک آرٹ (Saracenich Art) کا نمونہ ہی
 آرام فرمائے۔ اب اس سنگ مرمر کے تخت پر جسے نور جہاں جلوہ افروز
 ہو کر مناظر قدرت کا تماشا دیکھا کرتی تھیں مغرب کے رخ منہ کر کے کھڑے
 ہو جائیے۔ یہ ذہن میں رہے کہ یہ پہاڑ گئی چوٹی ہے سامنے ان باغات
 کے زینے ہیں جنکا ذکر ہو چکا ہے انکے بعد صرف ایک سڑک درمیان میں
 ہے پھر سیلوں تک اس ڈل جھیل کا پانی سطح پر اگڑا لیاں لیتا ہوا
 نظر آئیگا جسکی شفافی کی یہ بات ہے کہ تہ میں مچھلیاں چلتی پھرتی نظر
 آتی ہیں اور پانی کے اندر جو درخت اور بیل پھول میں بعض مقامات پر
 انکی پتی پتی دکھائی دیتی ہے (شکارہ میں چلتے وقت اس شفاف پانی
 میں اس پائس کے پہاڑوں اور باغوں کا جو عکس پانی میں لہرانا نظر آتا ہے
 اکثر میں ایسی نظرسے نشوں تک نہ ہٹا سکا) خیر اس تخت شامی سے
 نظر اور آگے بڑھائیے اور سامنے دور گلرگ وغیرہ کے برفانی پہاڑوں کو
 دیکھیے جنکی سفید برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں
 اگر یہ وقت طلوع آفتاب کا ہے تو تصویریں جبریز پر روہلی افشان
 چھڑکی ہوئی نظر آئیگی اور اگر غروب آفتاب کا وقت ہے تو آپ جہاں سے
 ہیں۔ یہاں سے لیکر بزقان تک یہ معلوم ہوگا کہ سنہری کرنوں اور نقشوں کا
 مینہ برسا ہے یہ مختصر بیان اس منظر کا ہے جو مینے اکثر شاطیاع و شالاب
 جاکر دیکھا ہے۔

نور جہاں کے مذاک
نشاط باغ و شالامار جگایان ابی ہوا دراصل نور جہاں کے
تیار کرائے تھے۔ جہاں جہاں شیریں حشمت معلوم ہوا
ایا جہاں پر لطف منظر دکھائی دیا وہاں اس مغلیہ خاتون نور جہاں نے اپنے
خیالات و مذاق کا عکس باغات کی صورت میں اس طرح چھوڑ دیا کہ آج تک سو
برس بعد بھی ہم اس سے لطف اٹھا رہے ہیں جب اس بڑے پے میں ان
باغات کے مناظر کا یہ عالم ہے تو جوانی میں دلفری کی کیا حالت ہوگی میں نے
اس نمونہ کے باغات کے آثار ویری ناگ اور اچھل وغیرہ مقامات پر بھی
دیکھے ہیں۔ ان پہاڑوں کو کیا دلی تعلقات ہونگے جنہوں نے انکی
یہ قدر و منزلت کرائی جس کا صرف خیال کرنے سے وجد آتا ہے غالباً ایسے
ہی وجہ کی حالت میں عربی نے کشمیر دیکھ کر وہ قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع
یہ ہے

ہر سوخت جانے کہ بہ کشمیر درآید
گر مرغ کباب است کہ بابا ان پر آید

جامع مسجد | ناظرین کو عہد مغلیہ کی قدیم عمارت میں لیجائے بغیر میں سرنگر
کے حالات ختم نہیں کر سکتا۔ سرنگر میں آج بھی مسلمان اس
جامع مسجد میں خدا کی عبادت کر رہے ہیں جو عہد شاہ جہاں میں بنی تھی
چھانک لکھن اور اسکی چھت کے ستون آج تک اسکے بنائے والوں کے
پاکیزہ خیالات اور اعلیٰ تمدن کا ثبوت ہیں یہ ستون دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے
کہ ایک بلند دیوار و رخت کا زبردست تنہ سالم کا سالم زمین میں نصب کر دیا گیا

وہ کونسا جبر قیل تھا جو ان ستونوں کو جھگڑ سے واپس لایا۔ ہم گزشتہ میں
 چالیس برس سے ایسی عمارتوں میں لکڑی کے شہتیروں کے بجائے لوہے
 کے گرڈ ورلج خاص فانی وسہولت استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن عمارت میں
 ہم کو لوہے کی عمر اسی پوری طرح معلوم نہیں ہوتی۔ تین سو برس کی پرانی
 مسجد کے ان ستونوں کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید عمارت میں
 لکڑی کی عمر زیادہ ہو ثابت ہو۔ اس مسجد کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے
 کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے سر سیکر کا دورہ کیا ہے تو وہاں کی رعایا
 نے کچھ شکایتیں اُسے حضور میں پیش کیں۔ اُس پر ایک فرمان نافذ ہوا اور
 یہ فرمان زبان فارسی میں اُس پتھر پر مجسمہ کندہ کر دیا گیا جو مسجد کے پہاڑ
 پر آج بھی نصب ہے اس کتبے میں منجملہ دیگر احکام کے ایک حکم ہے جس کا
 خلاصہ بدین مضمون ہے کہ ”مابدولت کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ
 زعفران کی پتی چننے والوں کو اور شال پر سوئی کا کام بنانے والوں
 کو بعض اوقات پوری مزدوری نہیں ملتی۔ لوگ اسکا اندازہ کر سکتے ہیں
 کہ اس قسم کے کام کرنے والوں کی آنچھوٹیہ کی قدر زور پڑتا ہے۔ امید ہے کہ
 آئندہ ایسی شکایات مابدولت کے کانوں تک نہ پہنچیں۔“ ناظرین خیال کر سکتے
 ہیں کہ رعایا کی رسائی اس بادشاہ تک کیونکر ہوتی تھی اور اس بادشاہ
 کے دل میں اپنی رعایا کے ساتھ کون سا رجمہ ہر دی تھی اور اس کی تحقیقات
 اور معلومات کی کیا حد تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ان مزدوروں اور کاریگروں
 کو کیسی کچھ مشقت برداشت کرنی ہوتی ہے اور اسکا انکی صحت پر کیا مضر

اثر ہوتا ہے لہذا اس شخص کا خدیر حکم لکھنے پر اکتفا نہ کی بلکہ رعایا کی تکلیف کے دفعیہ کے لئے اپنا حکم ایک ایسے منظر عام پر کندہ کرادیا جو اس وقت تک اس کی بیدار مغزی کے ثبوت میں آفتاب بنکر چمک رہا ہے۔

میں نے ناظرین کا بہت وقت ضائع کیا جسکی معافی چاہتا ہوں لیکن میرا اصلی مقصد بغیر اس تفصیلی بیان کے شاید نہ حاصل ہوتا۔

کشمیر کا تمدن | اب ان تمام واقعات پر فلسفیانہ گہری نظر ڈالئے۔ سائینس یہ بتا رہی ہے کہ نہ اروں میل کے لمبے چوڑے سمندر میں ایک کنکری چھوڑ دی جاتی ہے تو گو ہماری آنکھیں نہ دیکھ سکیں مگر اس کنکری سے جو لہر پیدا ہوتی ہے وہ او سو وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک اسکو سمندر کا کنارہ نہ ملے۔ اسطرح اگر ہوا میں حرکت کے ذریعہ سے کسی مقام پر کوئی لہر پیدا کی جائے تو اسکا اثر اس تمام کرہ ہوا پر پڑتا ہے جو زمین کو گہیرے ہوئے ہے۔ وائرلس (Wireless) یعنی بغیر تار کے خبر پونچانے کا طریقہ سائینس کے اسی اصول پر مبنی ہے۔ انسان کے دماغ میں بہت کم ایسے خیالات آتے ہیں جو اپنا کچھ نہ کچھ اثر اسکی روح پر نہیں چھوڑ جاتے اسطرح کوئی تمدن یہی کسی ملک میں وہاں کے باشندوں پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کیا ناظرین خیال کر سکتے ہیں کہ عہد مغلیہ کے بادشاہ کشمیر کو بہشت بنا لی کو شمن کریں اور اس سے وہاں کے لوگوں کا مذاق یا تمدن متاثر نہ ہو؟ میں جب کبھی شاطباغ و شالامار کو جایا کرتا تھا تو مجھے کو ایک بات ہمیشہ محسوس ہوا کرتی تھی کہ جمعہ کے دن سینکڑوں کشمیری معہ بال بچوں کشتیوں اور کھاروں

پرسوار ہو کر ان باغوں کو آتے ہوئے اور پھر وہاں دن بھر گزار کر شام کو
 دل جھیل کے راستے میں واپس جاتے ہوئے میں دیکھا کرتا تھا۔ میرا
 خیال ہے کہ یہ مذاق کسی تمدن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر زیادہ ثبوت کی
 ضرورت ہو تو اسی کشمیر کے پہاڑوں کی دوسری جانب تبت کی طرف
 جا کر جہاں عہد مغلیہ کے تمدن کا زیادہ اثر نہ تھا وہاں صنعت پر لہا سا پٹرن
 (*Lhasa Pattern*) کے بجگہ کہو پر نہایت ناک جانوروں
 کی صورت لکڑی اونندوں پر بنی ہوئی دیکھے اور پھر اسکا مقابلہ کشمیر پٹرن
 (*Kashmere Pattern*) سے کر لے۔ لکڑی پر۔ پتھر پر۔ شالوں پر
 قالینوں پر جہاں اہل کشمیر نے صنعت پر اپنا پٹرن و نمونہ دکھایا ہے
 وہاں خوبصورت خوبصورت چار کی پتیاں اور نازک نازک پھول بنے ہوئے
 نظر آتے ہیں۔ انہی دستکاریوں میں وہ جھاڑ فانوس دکھائی دیتے ہیں
 جو ایران کی صنعتوں میں ہوا کرتے ہیں انہی زبانوں کو ایرانی کھانوں کا
 مزہ عہد مغلیہ میں پڑا۔ اب کچھ ہی حالت ہو مگر کشمیر کے عہد باورچی کا
 یہ دعوے رہے کہ کسی دوسرے ملک کا باورچی اس سے بہتر و لذت نہ کھانا
 نہیں پکا سکتا۔ ذرا غور کر لے کہ یہ دُشمن اور کھانے دراصل کس ملک کے ہیں
 میری رائے میں کشمیری کھانے دراصل ایرانی کھانے ہیں کشمیر کی محوت پلاؤ
 سے شروع ہوتی ہے۔ اب تو انگریزوں اور ان کے مقلد انگریزی دانوں کے
 نئے مذاق نے کشمیری باورچیوں کو فن طباطخی اسطرح بھلا دیا ہے جیسے یورپ
 کے مشین کے بنے ہوئے سستے جامہ داروں نے کشمیر کی سوئی کی ہین دیرپا

اور خوش صنعت کو مٹی میں ملا دیا سرنگیر ایک وہ سرنگر تھا جہاں سترہ لاکھ تک کچی لاکھ روپیہ سالانہ کی شالیں یورپ کے بازار میں جا کر فروخت ہوا کرتی تھیں اور آج وہی سرنگر ہے جسے سو اگر سو اے نمونوں کے عہدہ شالیں بنا کر بھی اسلئے نہیں رکھتے کہ انکی مانگ شرح نمونہ دیکھ کر جب کوئی شخص خاص طرح پر فرمائش کرتا ہے تب کہیں مہینوں میں ایک آدہ سال بنا کر دیدیتے ہیں۔ اب تو کشمیر میں وہ پرانا کام نظر نہیں آتا۔ میرا اصلی پونٹ یہ تھا کہ عہد مغلیہ کے تمدن نے جمالیہ کے پہاڑوں کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے اور کشمیریوں کی صنعت و حرفت، تجارت، دولت، پوشاک، غذا اور انکے کل مذاق و تمدن میں بہت کچھ تبدیلیاں اسی دور مغلیہ میں ہوئی ہیں۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھ کر عہد مغلیہ کا مقابلہ اس زمانہ کی تمام دنیا کی سلطنتوں سے کر لیا جائے تو ہندوستان دنیا کے کسی حصہ سے ترقی و تہذیب میں کم نہ پایا جائیگا۔

ہندو کو مسلمانوں کے | ابھی تک ان ترقیات کا ذکر کیا گیا جو ہند کی زمین اور دریاؤں اور پہاڑوں اور تمدن میں عہد مغلیہ نے کر دکھائی وجود سے فائدہ

اب ہم اس ملک میں مسلمانوں کے وجود پر ایک سیاسی نظر ڈالنا چاہتے ہیں کیا اس ملک میں مسلمانوں کا وجود بالآخر مفید ثابت ہوگا؟ میری رائے یہ ہے کہ اگر ہند کی رگوں میں ترکستان، افغانستان و ایران و عرب کا خون شامل ہو گیا ہے تو اس اقلیت سے ہند کی اصلی اندرونی قوت میں اضافہ ہو گیا اور ہوتا رہیگا۔ بڑی بات جو ہند کو مسلمانوں کی آبادی سے عہد مغلیہ

حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ چنگیز خاں - تیمور یا نادشاہ کی طرح سیلاب کی صورت میں آکر پھر یہاں سے واپس نہیں گئے بلکہ مستقل طور سے یہیں بس گئے ہیں اور اس ملک کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ انہی کو فی حلقہ سول لائنیں (Civil lines) اس طرح کی نہیں ہیں جیسے ہمارے موجودہ حکمرانوں کی ہیں۔ وہ ہند کے گوشت پوست اور خون میں شامل ہو گئے۔ مجھے کو تو معلوم ہو رہا ہے کہ جو جو قوت انگلستان کی اصلی سیکسن (Saxons) کو ان کی سبزیں پر یورپ کی مختلف اقوام کے بن جانے سے بالآخر حاصل کی وہی قوت اہل ہند کو سرزمین ہند پر ایشیا کے مختلف مسلمان اقوام کے امتزاج سے بالآخر حاصل ہوگی۔ علی الخصوص حکم انہی آنے والی قوموں سے ہے جنہیں اسی میں جنکے آبا و اجداد وہی آریا تھے جنکی اولاد و اخصاً اوسل میں نو میکا فخر اہل ہند کو ہے۔ انگلستان کے باشندے اندرونی معاملہ میں چاہے کتنی ہی جنگ کریں لیکن جب جرمنی کا مقابلہ کر گیا تھا تو انگلستان کی کل آبادی ایک سپرنگٹی تھی کیونکہ غیروں کے مقابلہ میں غرض متحد تھے انسانی خلقت کا تقاضا یہی تھا۔ میری رائے میں ہند کی آخری حالت یہی ہونے والی ہے۔ آج ہر ملک کی قوت کا معیار اس ملک کی آبادی اور وہاں کے باشندوں کی جسمانی و دماغی قوت کا خزانہ قرار دیا گیا ہے جس اصول پر آج اٹریلیا، کناڈا، نیوزیلینڈ وغیرہ نوآبادیات والے۔ اپنی قوت بڑھانے کے لئے جو تدبیریں اختیار کر رہے ہیں اور یورپ کے باشندوں کو

اپنے ممالک میں لیجا کر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں وہی مقصد ہندو سیکڑوں برس ہوئے مسلمانوں کے آنے اور بس جانے سے حاصل ہو چکا ہے۔

پن اسلام ازم | لوگ بعض وقت میں اسلام ازم (Pan-Islamism) کے خیال سے چونکنا ہو جاتے ہیں یہم اس باب کے حصہ دوم

میں دکھلا دیں گے کہ پن اسلام ازم ایک خیالی چیز ہے جس سے خوف کہانا فضول ہے۔

مسلمان کیوں آئے؟ | ایک اور بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہئے وہ یہ کہ بے سوچیت آیا مسلمانوں کو اس ملک میں آنا چاہئے تھا یا نہیں اس طرح

فضول ہوگی جیسے اس ملک کے اُن اصلی باشندوں کا جو آریا قوم کے آنے سے قبل یہاں آباد تھے یہ اعتراض کرنا کہ اہل ہندو یہاں آکر کیوں بسے اور قابض ہوئے یا یوں کہئے کہ جیسے چھوٹے بھائی کے تولد ہو جانے کے بعد بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کی پیدائش پر اعتراض کرنا فضول ہوگا۔ مسلمانوں کو قدرت لائی یا شمشیر لائی یا ضروریات زمانہ لائیں کسی نہ کسی طرح وہ آگئے اور ہند کے گوشت و پوست میں شامل ہو گئے دیکھنا یہ ہے کہ جب وہ آگئے تو مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے تمدن کو انکی ذات سے فائدہ پہنچا یا نقصان اور یہی دکھانے کی کوشش لگائی ہے۔

مسلمان کے انحطاط | میرا خیال ہے کہ اگر کبھی مسلمان اس ملک سے نیست و نابود ہو گئے یا وہ اس قدر گر گئے کہ انہیں کوئی قوت باقی کا اثر ہند پر

نہ رہی (گو کہ ایسا ہونا محال ہے) تو ہند میں بھی ایسا انحطاط پیدا ہو جائیگا

جیسے کسی شہر کے ذریعہ سے جسم کا خون نکل جانے سے ہوتا ہے، دیکھ لیجئے جب اسپن مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور اسکی رگوں سے عریک خون ایک مرتبہ ملکر پھر نکل گیا تو جو انحطاط اسپن میں پیدا ہو گیا۔ اسکا علاج یورپ بھی آج تک نہ کر سکا۔ لیکن اگر مسلمان ہندوستان میں مثل اہل ہندو کے یہاں پھلتے پھوٹتے رہے تو اس ملک کی چہ چہ زمین کے لئے یہ اپنا خون بہا دیں گے۔ اس پر غور کیجئے کہ جب ہند میں عہد مغلیہ کا دورہ تھا تو وہ ہندوستان کو ہر بیرونی قوت کی مداخلت سے ہمیشہ محفوظ رکھنے میں کوشاں رہے خواہ وہ بیرونی قوت افغانستان کی ہو یا ایران کی ناشر کی ہو یا کسی دوسرے ملک کی ہو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انکا اصل مفاد و کامیابی میں ہے کہ ہند پر کسی غریب ہندی کا عمل خلل نہ ہو۔ مسلمانوں کے انحطاط سے اس ملک کی سپر کمرور ہو جائیگی۔

نقطہ نظر وسیع ہونا چاہئے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ عہد مغلیہ نے سرزمین ہند اور اس کے دریاؤں اور پہاڑوں میں کیسے کیسے بہترین تغیر پیدا کر دیے۔ اسکی تہذیب و تمدن پر کیا کیا اثر پڑا۔ سیاسی نقطہ نظر سے ہم یہ بھی بیان کر چکے کہ اس ملک کو مسلمانوں کے وجود سے کیا کیا فوائد نصیب ہوئے اور کیا کیا آئندہ ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

اب ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ ہندو براہمن و پن کے لئے عہد مغلیہ کے متعلق صحیح نقطہ نظر کیا ہوگا۔ کوہ ہمالیہ کے ایک خارجی مٹھیا اگر ہم ایک چینی کی طرح رنگینا شروع کریں تو چہ چہ

ہم کو تاریک و بدنام معلوم ہوگی لیکن اگر ہم کسی ہوائی جہاز میں ٹھہرا سیں
 عظیم الشان پہاڑ کی چوٹیاں، برفستان اور اسکا کل منظر عجیب و غریب
 سے دلچسپ تو پھر اسکی چھوٹی چھوٹی بدنمایوں پر نظر نہیں پڑتی اور وہ
 خوبصورت پہاڑ نہ صرف قدرت کا عجیب و غریب منظر معلوم ہوتا ہے بلکہ
 ہندوستان کی پشت و سپرد کہا جی دینے لگتا ہے۔ اسطرح اگر ہم عہد مغلیہ
 کے مکتروں کو علیحدہ علیحدہ دیکھیں تو ممکن ہے کہ بہت سے ٹکڑے بدنما معلوم
 ہونگے لیکن اگر اس کل عہد کے کارنامے جمع کئے جائیں یا اس عہد کی ایک
 پوری تصویر کھینچی جائے تو عہد مغلیہ ہی تاریخ ہند میں قدرت کا عجیب و غریب
 دلکش نظارہ معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کی تاریخ میں عہد مغلیہ
 اسطرح قابل فخر ہے جیسے عہد اشوک یا چندر گپت اسنے زمانہ کی حالت کے
 اعتبار سے تھا۔ ویدوں کے زمانہ بلکہ اسکے بعد کی بھی مکمل صحیح تاریخ ہند مرتب
 کرنا تو دشوار ہے لیکن آج ہم عہد مغلیہ کے ہر کارنامہ کو پیش کر کے ہند کی تہذیب
 دولت، تجارت، مذہبی رواداری، انتظامات، عمارات، باغات، اور
 کل تمدن کا مقابلہ دنیا کے تمام ملکوں سے کرنے کو موجود ہیں۔ ہم اپنے موجود
 یورپ کے حکمرانوں کے سامنے اس عہد مغلیہ کے کارنامے اس امر کے ثبوت
 میں پیش کر سکتے ہیں کہ اگر ہم کو پورا موقع دیا جائے تو ہم دکھا دیں گے کہ گو
 آج ہم بے بس ہیں اور موقع نہ ملنے کی وجہ سے اپنی اصلی قابلیت ظاہر
 نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم صدیوں اس ملک کی حکومت کا انتظام اوسنما
 سکے حالات کے اعتبار سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کر چکے ہیں۔ میری

رائے میں اگر ہند کی کل تانچ ایک مصرع زیور خیال کی جائے تو عہد مغلیہ اس کا وہ درخشاں اور شاندار کوہ نور نہیں رہوگا۔ جسے نکال ڈالنے سے زیور کی خوبصورتی اور جگمگاہٹ ہی جاتی رہیگی۔ یا کم سے کم یہ ہے کہ بالکل دھم ٹر جائیگی۔

اہل ہندو کا صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ میرے پاس اسوقت ستر جیسے جہاد یوگو و ندرینڈے کا وہ مضمون نہیں ہے جس میں انہوں نے عہد مغلیہ کی نسبت اپنا نقطہ نظر بتایا تھا لیکن جہاں تک میرا حافظہ مدد دیتا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ ہند کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں اس مراح ترقی میں عہد مغلیہ بھی ایک ضروری منزل اور زینہ تھا جس کے طے کئے بغیر ہند اپنی موجودہ حالت پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں اس رائے سے بالکل متفق ہوں۔ عہد مغلیہ نے ہند کو اس کے نصیب ترقی کے قریب پہنچانے میں مدد دی ہے اور کبھی اس میں عجز نہیں ہوا۔ عہد مغلیہ ہند کا وہ شاندار زمانہ ہے۔ جس پر اہل ہند کو فخر کرنا چاہئے اہل ہند کو چاہئے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان عہد مغلیہ کو اپنا عہد تصور کریں۔ یہ عہد غیر ہندی عہد نہ تھا اس عہد کا یہ مقصود نہ تھا کہ ہند کا مفاد کسی دوسرے ملک کے مفاد کا تابع ہو۔ عہد مغلیہ کی نسبت ہند و برادران وطن کا صحیح نقطہ نظر یہی ہوگا۔

باب دہم - حصہ دوم

مسلمانوں کا نقطہ نظر

تمہید | اب ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطہ نظر کیا ہو گا۔

میری رائے میں فی الحقیقت اس کا فیصلہ تو اسی روز ہو گیا تھا جبکہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن قرار دیا تھا۔ لیکن بعض وقت کچھ تو خود مسلمانوں کے طرز عمل سے اور بعض وقت غلط فہمی سے انکی سچی حب الوطنی کی نسبت شبہات کئے جاتے ہیں شبہات پیدا کرنے والا طرز عمل عموماً ان جذبات میں مضمر ہوتا ہے جس کا اظہار وہ مسئلہ خلافت اور ”پن اسلام ازم“ *Pan Islamism* کے سلسلہ میں کیا کرتے ہیں۔ ایسا ہی خارجی جوش میں محض زبان سے یہ کہہ گزرتے ہیں کہ ہم مسلم پہلے ہیں ہندی بعد کو ہیں۔ بس یہی ہمارے وہ نمائشی جذبات ہیں جو بعض اوقات یہی مطمع کو غبار آلود کر دیتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہمارے صحیح نقطہ نظر پر جو ایک دوسرا مسئلہ ہے پردہ ڈال دیتے ہیں۔

لہذا ہم اول اسی قسم کے جذبات کی واقعیت اور قوت پر ایک نظر ڈالیں تاکہ اس امر پر رائے ظاہر کرنے میں کہ ہندوستان کج متعلق ہمارا نقطہ

کیا ہے بالآخر ہم کو مدد ملے اور اس کے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ”سیاسی خلافت“ سے ہماری کیا مراد ہے۔

سیاسی خلافت سے مراد ”سیاسی خلافت“ سے مراد ہماری ایسی خلافت ہے جو تمام

دنیا کی مسلم آبادی کی (خواہ وہ کسی اسلامی سلطنت کی ہو

یا غیر اسلامی مملکت کی) مرکزی قوت بن کر اسکی متحدہ قوت کو کل مسلمانوں کے

سیاسی اغراض و مفاد کے لئے استعمال کر سکے اور اپنے قبض و اختیار میں رکھے

جس شخص میں یہ مرکزی قوت موجود ہو وہی سیاسی خلیفہ ہوگا۔ مسلمان خلافت

کیساتھ ”سیاسی“ کا لفظ استعمال نہیں کرتے لیکن ہم نے صرف سیاسی یا سیاسی

مرکزی قوت کے خیال و تصور کو مختصر الفاظ میں ظاہر کرنے کے لئے ”سیاسی

خلافت“ کے الفاظ استعمال کئے ہیں تاکہ بار بار مطول عبارت نہ لکھنی

پڑے۔ لہذا جہاں کہیں ہم ”سیاسی خلافت“ کے الفاظ استعمال کریں گے

ہماری مراد اسی قسم کی قوت سے ہوگی۔

”سیاسی خلافت“ کا معنی | منجملہ ان جذبات کے جو مہذب و تہذیب کے تعلقات سے مسلمانوں کے

نقطہ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ سیاسی خلافت کا جذبہ بھی

ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر غیر مسلموں کے دلیلیں اس کا خوف ہو کہ مسلم

اندر و بیرون طور پر کسی سیاسی خلافت کی حمایت میں اگر اپنے اصلی وطن کے

سیاسی مفاد کو پس پشت ڈال دیں گے یا اگر کوئی مسلمان کسی ایسی خلافت

کا خیال ہی دل میں لاتا ہو تو ہماری رائے میں یہ خوف اور یہ خیال و خیال

ایک خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ عملی طور سے نہ کہ یہی ایسا ہوگا

اور نہ ایسا ممکن ہے لوگ یہ کہیں گے کہ ابھی تک جو شخص مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کیا جاتا رہا وہ دراصل ایک سلطنت کا حکمران رکریات دن سیاسی سمندر میں غوطہ زن رہا۔ پھر یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ ”سیاسی خلیفہ“ یا ”سیاسی خلافت“ کا خیال نقش بر آب ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ایسا بادشاہ خلیفہ تو ضرور کہلایا گیا لیکن اس میں سیاسی خلافت کی قوت یا خلافت کے اوصاف کبھی نہیں پائے گئے۔

..... تاریخ اسکی شاہد ہے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد جو چار خلفاء راشدین کے بعد دیگرے ہوئے انکی نسبت تو کچھ شبہ نہیں کہ جو جذبات ان کے دلیں موجزن تھے وہ صرف اشاعت اسلام کے تھے۔ دنیوی بادشاہ یا یون کہئے کہ محض بنی نوع انسان پر حکومت کرنے کا خیال ان پر غالب نہ تھا۔ مگر ان چار خلفاء کے بعد یہ حالت نہ رہی جو بنی اسلامی سلطنتیں بیرون حدود عرب قائم ہونا شروع ہو گئیں انہیں وہی حالت پسند آئی ہو گئی جو فطرت کا تقاضا تھا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ یہی شہر کوئی آنحضرت کی بھی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سلطنت کے اغراض و مفاد علیحدہ علیحدہ ہو گئے اور پھر یہ محال ہو گیا کہ کسی ایک اسلامی سلطنت کا حکمران سیاسی امور میں کسی دوسری اسلامی سلطنت کی رائے و مشورہ کا محکوم اور پابند ہو۔ ایک بادشاہ خلیفہ تو کہلاتا رہا مگر اس میں سیاسی خلافت کی مرکزی قوت کبھی نہیں پائی گئی۔ یہ خلافت کبھی کسی اسلامی سلطنت کو دوسری اسلامی یا غیر اسلامی قوتوں کی دست درازی سے محفوظ نہ کر سکی

نہ کبھی یہ خیال تک ہوا کہ اُس کا زوال صہن خلافت کا (جزو فرعی سہمی) نقصان ہے۔ جب تاتاریوں نے بغداد کا پایہ تخت الٹ دیا مصر و اسپین تو کچا پڑوسی عرب تک امداد کو نہ پہنچے۔

جب شہزادہ فردینڈ اور ملکہ ایزبیل کے عہد میں لاکھوں مسلمانوں کے خون سے اسپین کے در و دیوار رنگین ہوئے اور اسلام کے لاکھوں نام لیوا جلا وطن کئے گئے۔ لاکھوں کلمہ گو یوں کو بالجمعیائی بھی بنایا گیا اور بے شمار مسلمان آگ میں زندہ جلا دئے گئے اُس وقت کوئی وہ مرکزی قوت تھی جو سپرینی؟

جب ہندوستان کے تخت تیموریہ پر یورپ کے سودا گروں اور ایٹ انڈیا کمپنی نے دست درازی شروع کی تب کوئی ایسی مرکزی قوت نہ پائی گئی جو اُن کو روک سکتی۔ جب یہ اسلامی قوت بھی نشت و نابود ہوئی تب سرزمین یورپ پر خلیفہ المسلمین کا وجود اور اُن کی حکومت یورپ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کہلنے لگی میدان صاف پا کر پہلے زار (۱۷۹۸ء) روس نے ابتدا کی۔ بحاس برس ہوئے جب صلیبیوں کے دروازہ پراکھڑا ہوا اور خلیفہ سلطان کو خواب غفلت سے بیدار کیا اس وقت اُن کے پاس کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جس سے اُن کو کچھ بھی بددلتی اور اُن کو ایک حد تک یورپ سے قدم ہٹانا پڑے۔ پھر تو یورپ کی یہ سلمہ پالیسی ہو گئی کہ ترکی کے قدم حلب و حمص کے شہزادہ سرزمین یورپ سے اکھاڑ دئے جائیں جب اس پالیسی کو اس قدر

نشوونما ہوا کہ اولاً اٹلی نے اور پھر بلقان کی پانچ متحدہ قوتوں نے تور
کی اندرونی کمک و مدد سے خلیفہ اسلام کے نشانچ ہلالی کو نچا دکھانا
شروع کیا تو انگلستان جیسے مدعی بے تعصبی کا وزیر اعظم بھی اپنے جوش
مذہبی کو روک نہ سکا اور عام جلسہ میں اسے اسپر اٹھا رہا کہ کیا آج
اسلام سچی مالک سے رخصت ہو رہا ہے لیکن پھر بھی دنیا کے مسلمان
تماشہ دیکھنے کے نہ کچھ کر سکتے تھے اور نہ کیا اور سلطان میں کوئی مرکزی
قوت ایسی نہ پائی گئی جو اس آڑے وقت میں کام آسکتی بالآخر خود یورپ
کی قوتوں میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور خلیفہ نے جو یورپ کی پالیسی سے عاجز
آگئے تھے اپنی آئندہ کی حفاظت اس میں ہی سمجھی کہ کسی قوت کا ساتھ دیکر
خود اس جنگ میں کودیں اس وقت دنیا کے مسلمانوں کی حمایت دینی
دیکھ کر جو کچھ سیاسی خلافت یا مرکزی قوت کی رہی سہی نمائشی دھاک یورپ
میں تھی اسکی بھی طبعی کھل گئی سب سے پہلا ملک جن نے خلیفہ کا ساتھ چھوڑا
وہ عرب تھا۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ سیاسی خلافت تو محال تھی ہی اور ترک
نے اپنے سیاسی مفاد سے عربوں کو ہمیشہ دبا یا بھی تھا۔ البتہ ہندوستان
کے چند مسلمانوں نے غل رکار چا کر معتد بہ رقم جمع کی مگر اس میں سے
ایک جزو قلیل جنگ کے بعد ترکوں کو بھیجا اور باقی خود صرف کر لی حریف
لیا پتھوپی کرنے کی کوشش کو دیکھ کر اور بھی نفرت بڑھتی ہے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ وہ شخص جسے سیاسی خلیفہ کے الفاظ کسی
تک صادق سمجھ سکتے تھے اسکو خود ترکوں نے دارالخلافت سے خارج کر دیا

اور اسکی وہ سلطنت جو یورپ و ایشیا کے برعظیم کا مقصد یہ حصہ گہرے ہوئے تھی سمٹ سمٹا کر انگورہ گورنمنٹ کی صورت میں ظہور پذیر ہو گئی۔ الحاصل اب اس دنیا میں آج کوئی ایسا شخص بھی نہیں دکھائی دیتا جو اس معنی میں سیاسی خلیفہ کہا بھی جاسکے جسکی تعریف ہم کر چکے ہیں۔ گزشتہ تیرہ سو برس کی مخالفت کی یہ مختصر حقیقت ہے اس کے ملاحظہ کے بعد کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ ابتداء کے چار خلفاء راشدین کے زمانہ کے بعد ان تیرہ سو برس میں جس جن بادشاہ نے مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کا دعوے کیا اسیں واقعی تمام دنیا کے مسلمانوں کی کوئی ایسی سیاسی مرکزی قوت موجود تھی جس کو وہ سب کے فائدے کے لئے استعمال کر سکتا تھا یا اس نے کبھی واقعی اس قوت کو استعمال کیا اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمام عالم اسلام کی قوت و تمدن سے محروم ہو گیا ہوتا۔ ہماری رائے میں یہ قصور محض خلیفہ کا نہ تھا بلکہ یہ امر بھی محال تھا۔ کیونکہ ہر ملک کی سیاسی ضرورتیں اور اغراض علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں بلکہ بااوقات باہم متضاد ہوتی ہیں اور اس حال میں ہر دنیوی بادشاہ کا ہمیشہ یہی فرض ہوگا کہ وہ اپنی رعایا اور ملک کے مفاد کو بمقابلہ دیگر ممالک کے مفاد کے خواہ وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہوں ترجیح دے۔ یہ تو خیر بادشاہ کا فرض ہے لیکن بادشاہ کو چھوڑ کر اگر کسی ملک کے مسلمان باشندے بھی اپنے سیاسی مفاد اور اغراض کسی ایسے خلیفہ بادشاہ سے وابستہ کرنا چاہیں جو ان کے ملک کا بادشاہ نہیں ہے تو وہ مسلمان اگر

خود مختار سلطنت بھی رکھتے ہونگے تو یہی کچھ عرصہ کے بعد اُسی قسم کی حالت
 حکومتی میں گرفتار ہو جائیں گے جیسا کہ اہل عرب عرصہ تک ترکوں کے
 ماتحتوں میں بادل ناخواستہ رہے اور اگر وہ مسلمان کوئی اسلامی خود مختار
 سلطنت نہیں رکھتے بلکہ دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ اُس ملک میں آباد
 ہیں جیسا کہ ہندوستان میں تو ایسی صورت میں اُس ملک میں اُن کا بقا و
 قیام دینا ہی شوار و محال ہو جائیگا جیسا کہ اجتماعِ مذہب کو نہ ایسی صورت
 میں مسلم اور غیر مسلم آبادی کے اغراض و نصب العین میں بہ مغایرت ہوگی
 ہماری رائے یہ تھی کہ یہی خلافت نہ کہی تھی اور نہ اس کا قائم کرنا ممکن ہے اگر
 ہماری رائے صحیح ہے تو مسلمانوں کو یہی خلافت کا خیال دل سے نکالنا
 چاہئے اور ہندوستان کے متعلق نقطہ نظر قائم کرنے میں اس خیال کو کچھ بھی دخل نہ دینا چاہئے۔
 خلافتِ بلائیا کا تصور ہم یہاں کوئی ایسی مذہبی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے جس کا تعلق
 اس کتاب کے اہل مضمون اور مقصد سے

نہ ہو۔ اس لئے ہم یہ مسئلہ اٹھانا نہیں چاہتے کہ
 بغیر کسی خلافت سے وابستہ ہونے کے کوئی مسلم آیا مسلمان رہ سکتا ہے یا
 نہیں۔ ہم صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اگر تمام دنیا کے مسلمانوں
 کسی مذہبی خلیفہ کو کھڑا بھی کیا تو اُس کی وقت اور حیثیت رفقہ رفقہ وہی
 ہو جائیگی جو مسیحی دنیا میں اب پوپ (Pope) کی ہے یا اگر وہ خلیفہ
 واقعی مقدس ہو تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے اہل تشیع میں محمد بن عبد العزیز یا
 اہل تسنن میں کوئی پیر طریقت کہ جس سے کوئی شرعی مسئلہ پوچھ لیا جائے یا

اُن کے حلقے میں صفائی قلب کی توقع سے کچھ لمحے بیٹھیا جائے۔ مگر میرے رائے میں مسلمانوں کو اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ چھوٹے گا۔ علامہ بریلوی اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں بھی ہمارے ذہن میں بڑی بڑی تباہ کاریاں آرہی ہیں جن کے بیان کرنے میں ہم کو اندیشہ ہے کہ ایک ایسی طولانی بحث میں پڑ جائیں گے جس کا اصل مضمون سے تعلق نہ ہوگا اور یہ بحث حقیقی شاہراہ سے بھٹکا کر عید گیوں کے دلدل میں پھنسا دیگی بہر کیف اول تو کوئی ایسا خلیفہ ہوگا ہی نہیں اور ہوگا ہی تو بلا کسی سیاسی قوت کے ہوگا جس کے خیال کا بھی ہماری رائے میں اہل منہ کی نسبت نقطہ نظر قائم کرنے میں خلل نہ ہونا چاہئے۔

خلافت کا عام تصور اس وقت خلافت کا عام تصور ہمارے براہِ راست مسلمانوں میں یہ ہے کہ خلیفہ ایسا مسلم بادشاہ ہو جو جزیرہ ہما عرب پر حکمران ہو اور اسکی حدود و سلطنت میں حجاز و شام - بیت المقدس و فلسطین و عراق وغیرہ شامل ہوں اور وہ بادشاہ حج کے موقع پر یا کسی اور طریقہ سے تمام دنیا کی مسلم آبادی سے تعلقات قائم کرے اور اپنی مرکزی قوت کو اسلام اور تمام مسلمانوں کے مفاد کے واسطے استعمال کر سکے۔ اس عام تصور میں اور ہماری اس سیاسی خلافت کے تصور میں جسکا ذکر ہو چکا ہے - بہت کم فرق ہے - یعنی صرف اسی قدر فرق ہے کہ اس میں چند ممالک اسلامیہ کی بادشاہت جزو لا ینفک ہے ہماری تو یہ عین خواہش ہے کہ اُن تمام ممالک پر جو گہوارہ اسلام ہیں - جہاں کے

ذرے ذرے سے انوار اسلام منور اور جن کے در و دیوار سے اسلامی مہم
 کے آثار پھیل رہی ہیں اور جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات و عبادت گاہیں
 واقع ہیں وہاں پر جم اسلام لہرائے اور مسلمانوں کی حکومت قائم ہے
 کیونکہ فی الحقیقت ان ممالک کی اصلی ہودی کے خواہاں جس طرح قدرتا
 مسلمان ہو سکتے ہیں ویسے کسی غیر مذہب کے لوگ نہیں ہو سکتے ہمارا
 یہ بھی خیال ہے کہ اس وقت انگلستان و فرانس نے ان ممالک میں اپنے
 اثرات کی جو باہمی تقسیم کر لی ہے اسکا اصل مقصد اپنے اپنے ممالک کو
 قائمہ پہنچانا ہے نہ کہ ان ممالک کی رعایا کو باوجود اس تمنا و خواہش
 کے ہماری تلئے یہ ہے کہ ان ممالک میں جو مسلم بادشاہ یا قوت ہوگی
 اس میں وہ مرکزی قوت پیدا ہونے کی امید نہ رکھنی چاہئے جس کا محال
 ہونا سیاسی خلافت کے ضمن میں ہم دکھا چکے ہیں۔ پھر بھی اگر ہمارے
 براہِ راست اسلام خلافت کے اس عام تصور کو کچھ نتیجہ بخش سمجھتے ہیں تو
 جہاں تک ہندو مسلم متعلق ہیں وہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں کسی
 وقت مدد دے سکتے ہیں جب خود ان میں کوئی قوت ہو اور ان میں
 اس وقت تک کوئی قوت نہ ہوگی جب تک وہ اپنے ملک ہندوستان
 کی سیاسی حالت اس بلند و رفیع پایہ پر نہ پہنچاویں کہ بحیثیت ہند
 ہونے کے اونچی کوئی قدر و منزلت ہونے لگے۔ لہذا مسئلہ خلافت کو
 خواہ ہم کسی پہلو سے دیکھیں مگر اس ملک کی سیاسی ترقی میں ہمارا نقطہ نظر
 وہی رہنا چاہیے جو یہاں تک غیر مسلم آبادی کا ہے۔

”پن اسلام ازم“

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں پن اسلام ازم کی ایک خطرناک قوت اس وقت پھیل رہی ہے جس کی

واقیعت کے معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ

”پن اسلام ازم“ *Pan-Islamism* کس قوت کا نام ہے۔

اگر ”پن اسلام ازم“ سے یہ سمجھا جائے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں

میں کوئی ایسی باہمی قرارداد ہے کہ ایک مقام کے مسلمان دوسرے

مقام کے مسلمانوں کو عملی حدود دیکر اس دنیا میں کوئی غلبہ حاصل کریں

تو حیثیت ایک مسلم کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ

ناممکن بھی ہے۔ ہماری رائے میں جن غیر مسلموں نے پن اسلام ازم

کی ہر صورت دنیا کے سامنے پیش کی ہے یا تو وہ غلطی میں ہیں

یا اس میں کوئی سیاسی غرض اس مقصد سے مضمر ہے کہ خواہ مخواہ

دنیا کو اسلام سے برگشتہ اور چوکنا رکھ کر دنیا کو اسلام کی مخالفت

اور اس کی بے محابا کئی ریتیں رکھا جائے۔ لیکن اگر ”پن اسلام ازم“

درحقیقت اس کشش کا نام ہے جو کسی ہم خیال یا ہم تمدن انسان

کے درمیان عادتاً ہوا کرتی ہے تو پن اسلام ازم کا وجود ہے

کیونکہ تمام مسلمان بعض اصولی باتوں میں ہم خیال بن جاتے ہیں

اور ایک حد تک انہیں کشش محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان کی

موجودہ سوسائٹی مختلف قسم کی قدرتی کششوں کا نتیجہ ہے ایسا

جامعیتیں خواہ کلب، کتبے، یا کسی اور صورت میں ہوں وہ صرف مختلف

اقسام کی کششوں کی مثالیں ہیں۔ ہم مذہبی ہیں ہی ایک کشش ضرور ہے اور اس کشش کی قوت کا معیار ان افراد کے مذہبی خیالات کی قوت پر منحصر ہو کر رہتا ہے جو ان سے متاثر ہوں۔ یہ عام اصول انسانی خلقت کے ہیں کچھ مسلمانوں ہی سے مختص نہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ یہودیوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہم مذہبی کی کشش موجود ہے۔ اسی طرح ہم ہونے کی ہی ایک کشش ہے جس میں مذہب کو دخل نہیں ہوتا اس کشش کا پورا جس اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے ملک سے باہر جا کر اپنے کسی ملک سے فرار ہوتے ہیں۔ ہندوستان سے یورپ کا سفر کرتے وقت جہاز میں قدم رکھتے ہی ہم نے دیکھا ہے کہ اس پندرہ روزہ سفر میں جو چھوٹی سی دنیا بحر ذخار میں حل ہوتی نظر آتی ہے اس میں جو سو سالیاں فوراً بجاتی ہیں وہ اسی ملکی کشش کے نمونے ہوتی ہیں۔ اس کشش کی ایک لحاظ مثال مجھے کو یاد آگئی۔ میں ایک مرتبہ رات کے وقت لندن کی انڈر گراؤنڈ (زیر زمین) ریل میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک کنڈکٹر بیٹھے ریل چلانے والے نے بڑے عجز سے میری طرف دیکھنا شروع کیا جو لوگوں نے لندن کی انڈر گراؤنڈ ریلوں میں سفر کیا ہے وہی اسکا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کنڈکٹر کتنا عظیم الفرصت ہوا کرتا ہے اور ایک ایک دو دو منٹ کے بعد وہ کس طرح ہزاروں آدمیوں کی ہستی ہوتی زندہ دہار کے رخ بدلتا اور مورتا بن جاتا ہے لیکن ملکی کشش اس قدر غالب تھی کہ اس عظیم الفرصتی میں بھی وہ میس پاس آیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ

ہندوستانی ہیں جب اس کو اس خیال کی تصدیق ہو گئی تو مسکرا کر کہنے لگا کہ میں بھی ہندوستانی ہوں۔ یہ کہہ کر پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کے چہرے بشرے اور حرکات و سکنات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مجھے دیکھ کر اس کو ایک خاص مسرت ہوئی۔ کیمج یونیورسٹی میں ہندوستانی طلبہ کا علیحدہ کلب کسی کثیر الشعبہ اصول پر مبنی ہے جس پر یہ سب مختلف قسم کی قدرتی کششوں کی مثالیں ہیں اور یہ جذب مقناطیسی اس وقت تک باقی رہیگی جب تک انسان کی خلقت قائم ہے۔ دیکھنا صرف اتنا ہے کہ جو کشش ہم مذہبی بنی ہوئی مسلمانوں پر ہے کیا وہ ایسا ہی نقطہ ہے جس سے غریبوں کے واسطے کچھ پرخطر ہے۔ یا مسلمانوں کے لئے ایک ایسی حل التین (مضبوط رسی) ہے جس کے بھروسہ پر وہ ہند کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں میں اسلام از ہم کی مذہبی کشش غریبوں کے واسطے کچھ بھی پرخطر نہیں ہے۔ اور جو وجوہ ہم سیاسی خلافت کے محال بننے کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں انہیں وجوہ پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کشش ایسی نہیں ہے جس کے بھروسہ پر ہم اپنے وطن کی فلاح و بہبود کی نقطہ نظر کو بدل دیں۔

مسلمانوں کا صحیح نقطہ نظر ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطہ نظیر ہو گا کہ وہ بلا لحاظ مذہب ملت اپنے کو تمام برادران وطن کے ساتھ ایک ہی کشتی میں بیٹھا ہوا تصور کریں۔ اور وہ کشتی ہندوستان ہے۔

جو طوفان اہل ہنود کو ڈبانے کی قوت رکھتا ہے وہی انکو غرقاب کرے گا۔ اور جو امن و سکون اہل ہنود کو ساحل مراد پر پہنچائے گا وہی مسلمانوں کو دنیاوی گرداب ہلاکت سے بچائے گا اگر کوتاہ نظری سے کام نہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے ہر باشندے کی ترقی و وقار کا عکس کسی نہ کسی حیثیت سے پلٹ کر دوسرے باشندوں پر بلا لحاظ مذہب ملت پڑتا ہے ہم کو اس امر کا پورا احساس کہ ہندوستانی عزت و ذلت کا اثر ہماری ذاتی عزت و ذلت پر کہاں تک پڑتا ہے اُس وقت ہوا جب ہم نے ہندوستان کے باہر سفر کیا۔ ہم نے سیکڑا میں ولایت سے واپسی کے بعد ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ دکھایا تھا کہ حدود ہندوستان کے باہر ہماری تمام عزت و وقار کا معیار لفظ ”ہندی“ ہونے میں ہے ہر مقام اور ہر سوسائٹی میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ غیر ملک میں پہلے لوگ اس کی جستجو کرتے ہیں کہ کون شخص کہاں کا باشندہ ہے اس کے بعد ان کی نگاہوں میں اس کا وہی وقار ہوتا ہے جو اُس کے ملک کی سیاسی و تمدنی حالت کا ہے جہاں کا وہ مسافر اصلی باشندہ ہے اُنکی وقعت یا تو ایک دم اُنکی نگاہوں میں بہت بڑھ جاتی ہے یا وہ نظروں سے گر جاتا ہے۔ کوٹ، پتلون، سہیت، صورت، وضع، قطع بلکہ ذاتی قابلیت بھی بالاطاق ہو جاتی ہے سیکڑا کے سفر میں بھی یورپ کے ہر مقام پر جہاں جہاں گئے ہم نے دیکھا کہ بلا لحاظ عزت ہم محض اپنے ہندی ہونے کی وجہ سے کہیں فیائدے میں رہے اور

کہیں گھاٹے ہیں۔

یہ عزت و خفت ہندوستان کی نسبت ہر شخص کے خیال میں مختصر تھی۔ اس میں مذہب کا دخل نہیں تھا۔ مجھ کو خیال ہے کہ ولایت میں ایک انگریزی خاتون نے مجھ سے یہ کہا کہ ایک مرتبہ اس کے بھائی نے ہندوستان سے لچھمی کی ایک مورت اس کو بھیجی اور یہ لکھا تھا کہ ہندویوں کے اعتقاد کے بموجب جس شخص کے پاس یہ مورت رکھی اسکو دولت ملے گی۔ اس پر خاتون موصوفہ نے مذاقاً کہا کہ اُن کو ابھی تک کوئی دولت نہیں ملی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ اعتقاد نہیں ہے مگر کسی طرح اُنکی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جب میں بھی ہندی ہوں تو اس عقیدہ کا قائل کیوں نہیں ہوتا۔ سرابند و ناتھ ٹاگور نے دوسرے ممالک میں سفر کر کے جو سکھ اپنی علمی لیاقت و انسانی وقار کا قائل کیا اس کا فائدہ بالآخر مذہب ہر ہندی کو پہنچے گا اُٹلی کے شہر وینس (Venice) میں ایک سوداگر نے اپنا قیمتی زیور بغیر فوری قیمت لئے ہوئے ہم کو اس اعتبار پر دیدیا کہ ہم ہندی تھے اور کسی شہر کی دوسری دوکانوں پر ایک سوداگر نے یہ کہا کہ ایک ہندی مسافر نے جن زیور کے خریدنے کا وعدہ کیا اُسے چھ مہینے بعد لوٹے و حب وعدہ اس نے خریدا اور ہندیوں کی اسی سادگی کی بناء پر اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر آپ بھی خرید کا وعدہ کر لیں تو زیور سب سے دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائیگا۔ یہ کچھ یورپ ہی کی کیفیت ہیں

بلکہ عراق اور نجد و عرب میں بھی جو ہندوستانی مسلمان زیارات اور حج کی غرض سے جاتے ہیں انکو تمام عراقی اور حجازی عموماً ہندو ہی کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے ایک ہندوستانی دوست بھٹا شرفیہ جبکہ وہ اپنے ساتھیوں کیساتھ آٹھ بارے تھے کچھ عربوں کے اشارہ کر کے کہا "ہذا شیخ الہند"

ہما نا گاندی کی روحانیت کی سہرت سے غیر ملک میں ہر ہندی بظاہر مذہب فخر کرنے لگتا ہے۔ انگلستان میں آپ کتنا ہی اکڑے لیکن انگریزوں کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ہندی ہیں تو بظاہر مذہب آپ کا وہی وقار رہ جاتا ہے جو ایک رعایا اور محکوم کا ہونا چاہیے جنوبی افریقہ اور دوسری نوآبادیات میں آپ کتنا ہی سرٹکس لیکن وہاں آپ کا شمار چشتی انسان وہ اپنے مساوی درجے کے لوگوں میں اس وقت تک ہرگز نہ کریں گے جب تک کل ہندوستان کا سیاسی یا یہ بلند ہندو امریکہ کے انکوریٹ میں اس امر کے فیصلہ کرنے میں کہ ہندی اون کے ملک کا کبھی سیزن *Citizen* نہیں بن سکتا یا مستقل باشندے کے حقوق نہیں حاصل کر سکتا اس ہندی کے مذہب کا خیال بھی ان کے دل میں آیا ہو گا جس کا مقدمہ ان کے روبرو پیش تھا۔ ہم کو اس وقت کسی مذہب کی صداقت و کذب سے بحث نہیں ہے۔ یہ تمام مثالیں ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں کہ بیرون حدود ہندوستان وہاں کے باشندوں سے ہمارا ہی مذہب کا فرق اٹھ جاتا ہے اور غیر ہندی لوگوں کی نگاہ

”ہندی“ محض ”ہندی“ ہی کی حیثیت سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے خواہ وہ کسی جاے میں ہو۔ ناظرین اس خیال کو دل سے نکال کر الیک ایک ہندی مسلمان اسلامی مالک جاکر دائرہ ہندی سے نکل جایا کرتا ہے۔ یہیں وہاں بھی ”ہندی“ ہی رہتا ہے۔ میری والدہ و شہیرہ حج و زیارات سے واپس آئی تھیں تو فرمایا کرتی تھیں کہ آنکھ قافلہ میں جب کوئی ہندی کسی بدوی عرب کی کافی خاطر مدارات نہیں کرتا تھا یا کافی انعام نہیں دیتا تھا تو وہ ”ہندی بطل“ کے الفاظ بطور تکیہ کلام کے ہر ہندی کیلئے جام طور پر استعمال کرتا تھا اور اس ہندی کا مذہب سلام اُس کو اذیت و تکلیف ہی سے بلکہ بعض اوقات قتل سے بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ اسی سال کا واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ کے راستے میں ہزاروں حاجیوں کا قافلہ بدوی عربوں نے روک لیا اور جب انکو کافی رقم نہ پہنچی تو سارے قافلہ کو بغیر مدینہ منورہ کی زیارت کے دھوکے واپس آنا پڑا۔ اور راہ میں ان مصائب کا سامنا ہوا کہ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ بدویوں پر مذہب کا کوئی اثر نہ تھا۔

سالگرزشتہ سلطنت حجاز عرب کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مصری ڈاکٹروں کا وفد حاجیوں کے علاج و معالجہ کے لئے حج کے زمانہ میں زمین عرب پر قدم بھی رکھے یا خیمہ نصب کرے کیونکہ سیاسی حیثیت سے اُن کی موجودگی انہوں نے اپنے لئے مضر خیال کی تھوڑا عرصہ ہوا جب مذہب کے وفد خلافت نے اسلامی جوش میں اگر مشورہ دینے کی غرض سے

سلطنت انگورہ میں اعلیٰ کی اجازت چاہی تو ترکوں نے صاف انکار کر دیا جس سے بہت سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہو گئی تین برس کا عرصہ ہوا جب صوبہ پنجاب و صوبہ سرحدی کے ہزاروں مسلمانوں نے ترک وطن کا خیال اس بھروسہ پر کیا تھا کہ افغانستان بحیثیت ایک اسلامی سلطنت کے اُن کا خیر مقدم اور آؤ بھگت کر لگا اور اپنے ملک میں آباد کر لگا۔ لیکن اُس ارادہ کو پورا کرنے میں جو جو نتائج سدا موعے وہ ہر باخبر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ہمارے دوست خواجہ غلام القلین مرحوم کہ ایک مرتبہ یہ جوش پیدا ہوا کہ ایران جا کر وہاں کے مسلمانوں کے خیالات درست کئے جائیں۔ اسلامی ہمدردی سے ایران پہنچے مرحوم میں اشیاء نقص کا بہت مادہ تھا وہ فرماتے تھے کہ ایرانیوں کو ان پر یہ شبہ تھا کہ یہ شخص ہندوستان کی خفیہ پولیس کا کوئی رکن ہے اور ان کو پھانسنے کے لئے آیا ہے۔ انہی منہدیت نے ایران میں ہی اُن کا چھپنا چھوڑا۔ عرض سخت مایوس ہو کر واپس آئے اگر ایران میں کوئی منہدی مسلمان اس طرح قتل کیا جاتا جیسے کہ ابھی چند دن پہلے کہ ایک امریکن سفیر کیا گیا تھا تو ہمارا خیال ہے کہ اسکی تلافی ہو گا اور اُس کے خون بہا کے لئے ایران صرف مذہب کی بنیاد پر اس حد تک تیار نہ ہوتا جیسا کہ امریکہ نے ایران کو مجبور کر کے آمادہ تلافی کیا۔ یہ سب صرف امریکہ کی سیاسی قوت کا زور اور اثر تھا۔ ان تمام مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ منہدی مسلمان ممالک اسلام

بھی ہندی ہی رہتا ہے جس سے ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ معاملات
 دنیوی میں کسی ملک کی مجموعی سیاسی و تمدنی حالت کا جو اثر اس ملک
 کے ہر باشندے پر پڑتا ہے اس کو مذہب نہیں روک سکتا منہ کے مہینا
 ہرگز خیال نہ کریں کسی دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملک کی سیاسی و تمدنی بہتر حالت سے مسلمانوں
 کی کوئی تکلیف اسلامی مقناطیسی اثر سے درست کر سکتی ہے۔ ایسا کبھی
 ہوا اور نہ ہوگا۔ قصہ کوتاہ سیاسی و تمدنی معاملات میں اہل ہندو و
 مسلمان ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور ہند کی سیاسی ترقی مجموعی
 حیثیت سے مسلمانان ہند کے وقار و عزت اور قوت کو اسی طرح
 گھٹاتی اور بڑھاتی ہے جیسے غیر مسلم ہندیوں کی عظمت اور وقار کو
 پس ہمیں ہندوستان کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے اور ہمارا
 یہی نقطہ نظر صحیح ہوگا۔

باہمی مطالبات کی نوعیت

ہم کو اس سالہ میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ
 ہر شخص کی نیت و غرض کا اثر اس کے افعال و معاملات
 پر کہاں تک پڑتا ہے۔ اس ملک میں ہندو مسلمان
 ایک دوسرے کے مقابلہ میں بعض مطالبات پیش کرتے ہیں۔ ہم یہ
 نہیں کہتے کہ مطالبات نہ کئے جائیں۔ باہمی صفائی اور سمجھوتہ اسی
 وقت کر لینا ضروری ہے۔ ہم نے اس پر خوب غور کیا ہے۔ باہمی مطالبات
 کے متعلق آج جس بات کو ہم لڑائی سمجھ رہے ہیں وہی اشدہ ہجاری
 صفائی اور صلح کا باعث ہوگی لیکن ہجاری راہ پر اگر ہندو مسلمان

ایک دوسرے کو اس نقطہ نظر سے دیکھنے لگیں جس کے قایم کرنے کی کوشش اس باب کے حصہ اول و دوم میں کی گئی ہے تو پھر باہمی مطالبات کا فیصلہ کرنے میں بہت کچھ سہولت پیدا ہو جائیگی اگر تمام اہل منود مسلمانوں کو اس نگاہ سے دیکھنے لگیں کہ ان کے عہد حکومت میں ہندوستان کے تمدن کو بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے اس ملک کے اب جزو لاینفک ہیں یہ ایک ایسا ذخیرہ دماغی و جسمانی قوت کا ہیں جو اس ملک کی بہتری کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے (جیسا کہ حصہ اول میں مفصل طور پر بتایا گیا ہے) اور اسی طرح اگر تمام ہندی مسلمان یہ خیال کرنے لگیں کہ ان کا وقار و ذلت اس ملک کے وقار و ذلت کے ساتھ وابستہ ہی اہل منود اس ملک کی صنعت و حرفت و دولت میں کوئی ایسی ترقی نہیں کر سکتے جس کا فائدہ صیرگی یا مغربی طریقہ سے بواسطہ یا بلا واسطہ مسلمانوں کو بھی نہ پہنچے گا۔ خلافت و بین اسلام ازم کی ائذہ قیامت کا فیصلہ نہ کر سکیں گی اور اس کے جوش میں وہ کسی طرح اس ملک کی سیاسی ترقی میں سدا راہ نہ ہونگے تو پھر ہماری نیتوں اور اغراض میں بہت کچھ یکسانیت پیدا ہو جائیگی ایک دوسرے کے مقابل سے شبہ کا بادل ٹھنڈا شروع ہو گا۔ باہمی تعلقات کا مطلع صاف ہو جائے گا اور ہم کو اپنے باہمی مطالبات کی نوعیت ایسی معلوم ہوگی گویا دو بھائی ہیں جو گھر کو بگاڑنا نہیں چاہتے بلکہ کچھ ایسا سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں کہ عرصہ تک اپنی متحدہ قوت اس گھر کے

بقا و قیام کے لئے صرف کریں اسکو سچائیں اور اُس کی نہ ہر اشک سے
دونوں بھائی منتفع ہوں۔ ہمارا یہ گھر ہندوستان ہے ہم چاہتے
ہیں کہ اس ملک کے کل باشندے اپنے اپنے مطالبات کی نوعیت
کو سمجھتے رہیں تاکہ اُن کا تفضیہ کرنے میں آسانی ہو۔ مطالبات
اس نیک نیتی سے کئے جائیں کہ ایک کو دوسرے پر کہہ بیجا غلبہ نہ
حاصل ہو دونوں کی بقا فیصلہ کی مشروط ہے نہ ایک جانب ہندو
راج کا خیال غالب ہو نہ دوسری جانب یاسی خلافت کی زمین ہو
اگر طبیعتیں اس رخ پر آجائیں تو بڑا پار ہے۔ جو مواد غلام میں آج
چل رہی ہے اُسے دیکھ کر ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک میں ملکی
قوت و جذبات تمام دوسری قوتوں اور جذبات پر غالب ہو جائیں گے
اور اس سے کسی شخص کا اصلی اصول مذہب پر رائج نہ آئے گی۔ فروغ
کا کچھ ہی حشر ہو مثلاً یہ باجایا جانے کا مسئلہ یا کسی جانور کے بیچ کرنے کا
حق لیکن ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک وقت آجائے کہ ایسے
مطالبات کی ضرورت ہو یا باقی نہ ہے۔ بہر کیف آج تو صرف اسکی
ضرورت ہے کہ ہم اپنے مطالبات کی نوعیت کو نہ نبھالیں۔

باب ۱۰ - حصہ سوم

نفاق کے نتائج و باہمی اتحاد کی تدبیر

تہیہ اگر شروع کے نوا ابواب باب دہم کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں۔
باب دہم کے حصہ اول و دوم کو اس آخری حصہ کی تمہید
سمجھنا چاہئے۔ شروع کے نوا ابواب میں صرف باب دہم لکھنے کی بنیاد
ڈالی گئی تھی اور باب دہم کے حصہ اول و دوم میں (جس میں ہندو
مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بحث لگائی ہے) اس آخری حصے کی بنیاد
ڈالنا منظور تھا۔ اس میں اہل ملک کے سامنے باہمی اتحاد کی تدبیر
پیش کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس مسئلہ پر اگر ناظرین میرے خیالات
پوری طرح معلوم کرنا چاہیں تو حصہ اول و دوم کو پیش نظر رکھیں۔
عداوت و کینہ و نفرت | جذبات کے نتائج
جذبات ہیں اور جب یہ کسی انسان میں سرایت کرتے
ہیں تو ان کا نکلا محال ہو جاتا ہے۔ خلیقت انسانی
کے جزو یا طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ انسانوں کی قومیں اور جماعتیں
آخر افراد ہی سے بنتی ہیں۔ اسلئے جب کسی جماعت یا قوم میں کینہ و
نفرت کا مادہ کسی دوسری جماعت اور قوم کے خلاف سرایت کر جاتا ہے

تو اُس کا دور کرنا بھی ویسا ہی سخت دشوار ہوتا ہے جیسا کہ کسی ایک فرد کے دل سے ان جذباتِ ردِیلہ و مقتضیاتِ ذمیمہ کا نکالنا اور جب کسی ہوتو قوموں میں یہ صفاتِ ردِیلہ انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تو اُس وقت اُن دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کا فنا ہو جانا ہی اُس کا علاج ہوتا ہے! اسپن ذرا شک نہیں کہ کینہ اور نفرت کی قوت کشیش ہم ملکی و ہم وطنی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ مثلاً مسلمان و عیسائی گوصدیوں تک ایک ہی ملک اسپن میں رہے سب لیکن اُن دونوں میں دوسرے کی طرف سے آتشِ نفرت بھڑکتی رہی۔ اسپن کے مسلمانوں کا فنا ہو جانا اُس کا علاج ثابت ہوا۔ اگرچہ ہر مورخ تسلیم کر رہا ہے کہ اُس نے فنا ہو جانے سے جو کمزوری اسپن میں پیدا ہو گئی وہ آج تک دور نہ ہو سکی حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہو جانے کے واقعہ کو گو دو ہزار برس گزر گئے مگر جو اشخاص اس اندوہناک و ناشدنی فعل کے مرتکب ہوئے تھے اُن کی خاک کیا نام و نشان کا بھی پتہ نہ رہا ہے

پنداشتِ ستمگر کہ ستمِ برباد
برگردن او بماند و برباد بگزشت

لیکن آج بھی روپ، جرمنی، آزاد انگلستان اور امریکہ کے عیسائیوں کے دلوں میں گھس کر ذرا یہودیوں کی طرف سے اُن کے جذباتِ نفرت کا کوئی تماشہ دیکھے۔ اسی سال لندن کی وِملبی نمائش

میں ایک انگریزی عینک ساز نے ہمارے اعتبار سے یہاں فائدہ اٹھا کر ہم سے کچھ رقم وصول کر لی۔ جب ہم لندن کی ایک دوسری بڑی دوکان سے عینک خریدنے گئے تو اس دوکان کا مالک طیش میں آ کر کہنے لگا کہ افسوس ایک یہودی نے آپ کو ٹھگ لیا۔ میں یہیں کہتا کہ یہ یہودی ایسا ہوتا ہے لیکن یہ صرف اسکی ایک مثال ہے کہ ایک غیر یہودی انگریز کا جذبہ ایک یہودی انگریز کے مقابل میں آج تک کیا ہے اور یہ کچھ عیسائیوں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ سے یہود کے سلوک نامحسوس کا ہی یہ بھی نتیجہ ہے اور اسی ہے کہ آج عراق میں مسلمان بھی یہودیوں کو ایسا ہی برا سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ یورپ میں عیسائی۔ ہم مذہب شخص خاص میں بھی اس بغض و کینہ و نفرت نے کیا کیا گل بچ نہیں کھلائے۔ خواہ یہ ہم مذہب عیسائی رہوں یا مسلمان۔ آخر جرمن و فرانس پر وہی ہو کر رہی کیوں ایک دوسرے سے بیزاریں۔ آج یورپ کو اپنی تہذیب و تمدن پر فخر ہے لیکن وہ تمام تمدن و تہذیب اس کینہ و بغض و نفرت کے جذبات سے دیکر فنا ہو جاتی ہے۔ آئرلینڈ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے لیکن چار سو برس سے کینہ و بغض و نفرت کی جو آگ اس کے شمالی و جنوبی حصوں میں بھڑکی ہوئی ہے۔ اس کے مجھانے کی تدبیریں بڑے بڑے مدبرین کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ مسلمانوں کے باہمی تفرقہ کی حالت بھی سب کو معلوم ہے قصہ کوتاہ ایک ہی ملک کے باشندوں کی مختلف جماعتوں میں ایک

دوسرے کے خلاف نفرت و کینہ کے جذبات کا پیدا ہو جانا اس ملک کی بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ہندوستان کی گزشتہ عہد مغلیہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی جو حالت تھی اسکی تصویر ہم نے باب سوم میں مذہبی پروا داری کے سلسلہ بیان میں صفحات (۷۷) لغایت (۱۴۰) کھینچی

اور ہم کو خود اپنی زندگی کے ان واقعات کا ہوش ہے کہ ہم اپنے ہم معاش مسلمان بزرگ کا نام لیکر نہیں لکھا سکتے تھے بلکہ اپنے بزرگوں کی تربیت کے اثر سے بلحاظ تفاوت عمر کسی ایسے رشتے سے منسوب کر کے مخاطب ہوا کرتے تھے۔ مثلاً چچا۔ دادا۔ بہائی وغیرہ۔ خیر یہ تو ہندوستان میں باہمی اتحاد کی گزشتہ حالت تھی۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے حال میں اس وقت تک جوڑائی جھگڑے ہندو مسلمانوں میں تو نہیں آنی پائی۔ بنا اور نوعیت کے متعلق ہم اسنی مفصل رائے باب سوم کے آخری حصے میں ظاہر کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں ابھی تک فتنہ و فساد چند جاہل شر النفس اشخاص کی ذات تک محدود ہے۔ ہم کو گلہ گہ دہلی یا اسیسی میں ایسے جھگڑوں سے زیادہ خدشہ نہیں ہے کہ وہ تو ہوا کے جھوکوں کی طرح آکر چلے جائیں گے جس سرزمین پر گوروں بنی نوع انسان مختلف القوام و المذاہب ایک دوسرے کی دیوار کے زیر سایہ آباد ہیں وہاں کبھی کبھی ایسا ہو جانا چنداں بعید نہیں ہے لیکن اطمینان بخش اور امید افزا بات یہ ہے کہ یہ جھوکے دیر پا اور

مستقل نہیں ہوتے بلکہ جہاں کہیں آندھری کے جھوکے کی طرح چل کر کچھ اختلافی جذبات کو اُٹھار کر مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں وہاں بہت جلد امن و سکون قائم ہو جاتا ہے اور روزانہ کاروبار و دنیوی بدستور چلنے لگتا ہے۔ ایسے جہوں کوں کی روک تھام تھوڑی سی انتظامی قابلیت سے ممکن ہے اور یہ سب فروغ میں لکین ہم کو اندیشہ ہے تو اس کا یہ کہ کہیں یہ شعلہ بڑھ کر سوسائٹی کی تعلیم یافتہ اور بلند طبقتوں کو مستقل نہ کرے۔ خوف ہے تو ایسے صح کا ہے کہ وہ دلوں میں جم کر نشوونما کمنے اور اُن کی جڑیں اور شاخیں نہ معلوم کہا تک پہنچیں۔ اگر آئندہ غلط واقعات تعلیم یافتہ طبقے کے دلیں جاگزیں ہو گئے اور اُن کے دلوں میں اختلاف کی بارود پھردی گئی تو کچھ آگ کے تباہی کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ خود خیالات کی کشمکش اور جو طبیعت شعلہ ور ہوگی آتش فشاں کی شکل کر دیگی اور ہندوستان تباہ اور ہندوستانی جل جہنم بن جائیں گے اور یہ شہر صادق آئیگا۔

شعلے بھڑک بھڑک اُٹھے دل کے دماغ سے

اس گھم کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جو ڈھانچہ اندین نسل کا گریں نے چا پس بیل کی محنت سے تیار کیا

اک دم گرجا آئیگا۔ ہندوستان میں اہل ہنود اور مسلمانوں کے اصلی تضاد کی لہریں سمندر کے بڑے طوفان سے کم نہ ہونگی بہرہ کہنا دشوار ہو گا کہ ہمارے کئی اس طوفان کی تصویریں کیوں کیج سکیں اور نازل مقصود اس خطم اودھ کی سا کیونکر

نصیب ہوگی ایک زمانہ میں تو یہ ممکن ہوا تھا کہ مسلمانوں نے اسپین کو آٹھ سو برس کے بعد بھی چھوڑ دیا۔ لیکن اس زمانہ میں مسلمان اپنے وطن ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکیں گے۔ لہذا ہندو مسلمان دونوں بھائیوں میں مسلسل تصادم کی حالت قائم ہو جانے سے ملک کی جو حالت ہوگی اسکے خیال سے بھی روٹنے لکھڑے ہوتے ہیں۔ ہر دور اندیش ہندوستانی سمجھ رہا ہے کہ ہاتھ باندھ کر ہی صلح قائم کر نیکی کوشش میں کیوں اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہ اس تصادم کے نتائج کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ ہماری راک میں اس وقت بھی کافی اتحاد موجود ہے اور جو کچھ بگڑے ہوئے تیور نظر آتے ہیں انکی اصلاح بھی ممکن ہے۔ مرض لاعلاج نہیں ہے پس ہم کو ابھی سے مؤثر تدابیر کو نہ صرف سوچنا بلکہ عمل میں لانا چاہئے اور ہم کو علاج واقعہ قبل از وقوع باید کرد۔ یہ کار بند ہونا چاہئے۔

مستقل اتحاد کی اصلاحی ہماری رائے میں مضبوط بنیاد پر مستقل اتحاد قائم کرنے کی صرف ایک ہی یہ تدبیر ہے کہ ہندوستان اکی صحیح تواریخ ہمارے ہندوستانی نقطہ نظر سے لکھی جائیں جن میں تعصب کو دخل ہو نہ غلط فہمی کا امکان اور وہی ہمارے نو تھالان ہائے بیٹے ہندو مسلمان بچوں کو پڑھانی جائیں جو اچانک توڑ پھوٹ کر جھگڑائی کے جذب کرنے میں بچوں کے قلوب ہوم کی خاصیت رکھتے ہیں جس سانچے میں ڈالو ڈیل جائیگے۔ اور وہی شکل و صورت اختیار

کر لیں گے۔ پس اس ہوم کے دلوں کو فواد بنانا چاہئے جو مضبوط ہو اور اس طرح نقش و نقش کا لہجہ ہو۔ یہ سمجھ لیا چاہئے کہ اگر بنیاد غلط پڑ گئی تو سارا مکان ٹیڑھا ہو جائیگا۔

نشت اول گر ہند معمار کج

تاثریامی رود و نوار کج

اگر ہندوستان کی یہودی پیش نظر ہے تو آئندہ نسلوں کے خیالات کی درستی کا انتظام آج ہی سے کرنا چاہئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی تباہی میں غلط واقعات اور کئے جائیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ صحیح جو واقعہ ہو وہی لکھا جائے تاکہ تاریخ کی اصلی عزت اور گزشتہ امور سے جو بڑے بھلے نتائج برآمد ہوتے ہیں ان سے اطلاع ہو۔

مذہب کا نقطہ نظر ذرا بدل جانے سے پڑھنے والے کے دل پر اسکی تحریک کا اثر بھی بدل جاتا ہے خاص کر بچوں کے دل پر ہندوستان کی جو تاریخیں عموماً ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں وہ ہماری رائے میں غلط اصول پر مبنی ہیں۔ کہیں تعصب ہے اور کہیں خود بتائی اور دوسروں کی بھلائی کی بد نمائی اور اخلاقی حقیقت۔ ان میں عموماً وہ واقعات نہیں لکھے جاتے جن کا لکھنا ہمارے نقطہ نظر

سے ضروری ہے۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہتے کہ اورنگ زیب کی انسانی کمزوریاں نہ بتائی جائیں لیکن اعتراض یہ ہے کہ اس کے عہد کی جو بیا بھی کیوں نہیں بیان کی گئیں۔ اس کے علمی مذاق اور اس کے زمانہ

کی اشاعت تعلیم کا مفصل ذکر کیوں نہیں کیا جاتا جس کے کچھ حالات
باب دوم میں لکھے گئے ہیں صرف ایک کتاب قتا وائے عالمگیری ہی
کو دیکھئے کہ کتنی طرح کس تخت اور کتنے مصارف سے تیار کرانی گئی تھی
اگر اونگ زیب کے نصب کا ذکر کیا جاتا ہے تو ذمہ میرواداری
کے معاملہ میں ملک کی اس حالت کا ذکر بھی کیوں نہیں کیا جاتا جس کی
کیفیت باب سوم میں مفصل بیان کی گئی ہے۔ یہ بھی کیوں نہیں کہا جاتا
کہ اسکا ایک وزیر راجہ ہے سنگہ اور فوج کا کمانڈران چیف راجہ رام سنگہ
تھا اور اس کا ایک فرزند شہزادہ اکبر مندرانی کے بطن سے تھا اور سنگہ
نے اس سرزمین کی تجارت و متول و فارغ البالی کی جو حالت پیدا کر دیا
تھی اور جی شہادت باب چہارم میں لکھی ہے اس پر کیوں مہی
ڈالی جائے اور وہ ہمارے طلباء کو کیوں نہ پڑھائی جائے۔ انصاف
و امن و امان کے متعلق جو حالات ہم نے باب پنجم میں لکھے ہیں اور
صنعت و حرفت کی نسبت جو مواد ہم نے باب ششم میں جمع کیا ہے اگر
یہ بواقعات صحیح ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ یہ اُن تاریخوں میں بھی ہو
جو ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں تاکہ انکو معلوم ہو کہ عہد مغلیہ کی
حکومت کیسی قابل قدر ہندوستانی حکومت تھی اس حکومت کا
مقصد ہندوستان کا فائدہ تھا اور اس سے واقعی ہندوستان کو
فائدہ پہنچا۔ کیا انصاف کا خون ہوگا اگر اس شریفانہ و شاکہ نہ بڑاؤ
کے ذکر کرنے کی بجائے جو اونگ زیب نے ہمیشہ یورپ کے تیار کیا تھا

کیا اور جکی تحریری شہادت کا حوالہ باب ششم میں دیا گیا ہے یہ کہا جاتا ہے کہ اوزنگ زیب نے غنیمت ممالک کے سوداگروں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا۔ جیسا کہ رسالہ "زمانہ" کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے اور جس کا حوالہ باب اول میں دیا گیا ہے اور پھر یورپین تجارت کے ساتھ اوزنگ زیب کا برتاؤ دکھانے میں خود ان تجارت کی اس اخلاقی حالت و پالیسی پر پردہ ڈالا جائے جس نے مندرستان بادشاہ کو مندرستان میں بادشاہت کرنا دشوار کر دیا تھا جس کی مفصل کیفیت باب ہفتم میں دکھائی گئی ہے جو تاریخیں جو کھڑائی جاتی ہیں ان میں اوزنگ زیب شاہ جہاں و دلا شکوہ کے باہمی دو آپسوں کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے جس کی غلطی کی اندرونی زندگی بھی دکھانے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن اس معاہدہ فقیرانہ زندگی اور خدا پرستی کا ذکر بالکل ہی نہیں یا اس قدر کم اور وہ بھی اسلوب کے عدم وجود کیساں ہو۔ کیا جاتا ہے جس میں ان کے عقیدے کے درشن کا طریقہ موقوف کرایا۔ دربار میں رقص و سرود و تہنیت کے مشاغل بند کرادئے۔ محکمہ احتساب قائم کرادیا اور خود اپنے جیب خاص کے مصارف کی رقم کو بھی کم کرادیا۔ اوزنگ زیب اور ہر مہنوں سے جو لڑائیاں ہوئیں ان کا تو مفصل حال بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا بہت کم ذکر ہوتا ہے کہ اوزنگ نے اپنی رعایا کے آرام و فلاح و بہبودی و دلجوئی کے لئے کون کون ٹیکس موقوف کئے تھے اور عہدہ داروں کی نذر اور ضبطی مال کے قواعد میں کیا کیا ترمیم کی تھی۔

ٹھہکی ٹھہکتی کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان ہمیشہ ٹھہکی ٹھہکتی
 کا جو لانا گاہ تھا لیکن اس کا ذکر نہیں کیا جاتا کہ ٹھہکی کن صورتوں میں
 اور کیوں ہندوستان میں رائج ہوئی اور اسکی اصل منہ داری کس پر ہے
 اور کیا اسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ سے پہلے بھی ان ٹھہکوں کا وجود
 تھا۔ بہر سلطنت میں خوبیاں اور برائیاں دونوں جیسی اور جو کچھ ہو
 اگر کوئی موضح بیان کر دے تو شکایت نہیں لیکن اگر کوئی موضح بہر سلطنت
 کے نقائص تو بڑے زور دیا اور موثر الفاظ میں پیش کرے اور
 فوائد کا حوالہ دہی زبان سے دسمے لفظوں میں کر یا اُن کو ترک کر کے
 آگے بڑھ جائے تو اس سلطنت کے نقائص ظاہر اور فوائد چھپا کر
 سے چھپائے ظاہر نہوں گے۔ نتیجہ برعکس ہوگا۔ ہماری رائے میں جو
 تاریخ نویس اب تعلیم میں مقرر کیجاتی ہیں ان سے بہت کچھ نقصان پہنچ
 چکا ہے اور آئندہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور یہ ہمارا ذاتی
 تجربہ ہے اور ہر شخص اپنی غور و فکر سے اس کو دریافت کر سکتا ہے ہم
 یہ نہیں کہتے کہ ان تاریخوں میں سب واقعات غلط لکھے ہیں لیکن یہ
 ضرور سمجھتے ہیں کہ واقعات پورے پورے نہیں لکھے جاتے اور صحیح
 اسلوب میں بھی نہیں لکھے جاتے۔

جس طرح عہدِ غلیہ کی صحیح تاریخ ہندو بچوں کو پڑانے کی ضرورت ہے
 اسی طرح مسلمان بچوں کو بھی ہندو پیر (عہدِ ہندو) کی صحیح تاریخ اور
 صحیح واقعات سے آگاہ کرنا لازم ہے اگرچہ اس زمانہ کے حالات کا

پورا مواد و ماخذ ہمارے پاس نہیں ہے لیکن جس قدر ہے وہ ایسا ہے کہ
 ہر مسلمان بحیثیت ہندی ہونے کے اُس پر فخر کر سکتا ہے۔ عہدِ منور کی دولت
 ثروت، تمدن، اخلاقی تعلیم و علمی ترقی و عہدہ کی نسبت صحیح تاریخی حالات
 ایسے پیرائے میں لکھے جاسکتے ہیں کہ انکا اثر مسلمان بچوں کے دل پر
 خاص طور پر پڑے۔ جہا بھارت - رامائن - بدھ اور اشوک کے
 زمانہ کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ تاریخِ ہند کے دس پانچ صفحے میں
 لکھ کر ختم کر دئے جائیں۔ ہمارے لڑکوں کا کیر کمر بھی ہندوستان
 کے ایسے مشہور و معروف ارواح کے حالات سے بہت کچھ درست
 ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ہم نے ہندو مسلمانوں کے نقطہ نظر کے متعلق حصہ
 دوم میں لکھا ہے اگر ہماری وہ تصحیح ہے تو پھر جو تاریخیں ہمارے
 بچوں کے نصاب میں مقرر کی جائیں وہ اُسی نقطہ نظر سے لکھی جانی چاہئیں
 بڑی بڑی فلسفیانہ و علمی تاریخیں سن رسیدہ شخصوں و رشتہی طلباء کے
 لئے خواہ کوئی موزن کسی طرح لگتے۔ سن تیز و تنقید کو پوچھ کر شخص صحیح
 و غلط۔ واقعیت اور تصنع میں امتیاز کر لیا مگر بچوں میں یہ قابلیت کہا
 ہے اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہندو مسلمان بچے ایک ہی گہوارہ
 محبت میں پرورش پائیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہو گا جب اس ملک
 کی صحیح تاریخ بچوں کو پڑائی جائے۔ اب صیغہ تعلیمِ ہندوستانوں کے
 سپرد ہو چکا ہے پس ہر ہندوستانی منسٹریا وزیر کا فرض ہے کہ جو تاریخ
 بچوں کے نصاب میں مقرر ہے اس کی خود ملاحظہ فرمائے اور باجرا صاحب

اور انجام میں و نکتہ رس اشخاص سے انکی جانچ کر اے اور اگر ذرا بھی اس میں تعصب کی بو موجود ہو تو ان کو نامنظور کر دے بلکہ ہر صوبہ یا ایک انعام دس ہزار روپے کا مقرر کیا جائے کہ سرشتہ تعلیم کا متعلق یا غیر متعلق جو شخص ہندوستانی لڑکوں کو پڑھنے کے لئے سب سے اچھی تاریخ اس نقطہ نظر سے لکھ سکا جس کو ہم اپنے ملک کی بہبود کیلئے اور آئندہ نسلوں کے واسطے مفید پائیں گے وہ اس انعام کا مستحق ہو گا اور پھر ہر سال تک ہی تاریخ ہمارے بچوں کو اسکول میں پڑھانی جائے بہ کیف ہماری رائے میں مستقل اتحاد قائم کرنے کی بڑی تدبیر ہی ہے کہ ہمارے ہندو مسلمان بچوں کے واسطے صحیح تاریخ ہندو نصاب تعلیم میں داخل ہو۔

اتحاد کی دیگر تدابیر | ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی اصل تدبیر تو ہم بتا چکے۔ اب بہت سی چھوٹی چھوٹی فروعی تدبیریں ہیں جن کے اختیار کرنے سے بھی اصلاح میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

(۱) ہماری راکمیں اتحاد قائم رکھنے کی تدبیروں کا کام ہندوستان کے ضلع کی کنگرین کی کمیٹی کے سپرد کیا جائے اور اس کی اختیار دیا جائے کہ اگر ہندو اتحاد کے لئے وہ حسب ضرورت مقامی غیر مقامی اشخاص کو اپنی کمیٹی کا ممبر بنائیں اتحاد کی عملی تدبیر کرائسٹل کنگرین کا دیا ہی

اضلاع کی کنگرین
کمیٹیوں پر بار دالنا

اسم فرض و پروپیگنڈا ہونا چاہئے جیسا کہ دوسری سیاسی معاملات کے دستور العمل پر کاربند ہونا بغیر اتحاد کے سواراج کا حاصل کرا محال ہے اور اگر وہ ملاہی تو بیکار ہوگا۔ ہتھیار کی یہ کانگریس کہی اپنی مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے اتحاد بڑانے کی تدابیر اختیار کرے گی۔ اگر ممکن ہو تو مقامی عہدہ داروں کو شرف و فادہ ترغیب کرنے میں بھی مدد دیگی۔

(۲) افسوس ہے ایسی تک نیشل کانگریس کا کوئی خاص اجلاس اتحادی لٹریچر کی بہرہ نفع نقطہ نظر کا دینا نہیں ہے ورنہ اس کا ایک کالم اس کے لئے وقف کیا جاتا تاہم ملک میں اور بہت سے اردو انگریزی اخبار میں ان اخبارات اور رسالہ جات کے ایڈیٹر مسند و مسلمانوں کے نقطہ نظر کے بارہ میں ہماری سوسائٹی سے اگر متفق ہوں جن کا اظہار اس باب کے حصہ اول و دوم میں کیا گیا ہے تو وہ اسی عنوان پر مسلسل مضامین اس وقت تک شائع فرمائے رہیں جب تک کہ لوگوں کا نقطہ نظر نہ بدل جائے اور اہل ملک کے خیالات میں تبدیلی نہ پیدا ہو۔ محض اتحاد و اتحاد دیکار نے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ مقصد اس وقت حاصل ہوگا جب ملک میں اس قسم کے مضامین کی بھرمار کر دی جائے۔

۱۲۵ اس کے کی دہلی کی اتحادی کانفرنس نے بہت کچھ کام کی اتحادی لٹریچر کیا ہے۔ جو عام اصول اس کانفرنس نے قائم کئے ہیں ہم ان سے بالکل متفق ہیں۔ کسی کی مذہبی آزادی میں ذرا سا فرق نہ آتا ہے۔

ہر شخص کو اختیار ہے کہ خدا کی پرستش کے جذبات وہ جن حرکات جہانی سے ظاہر کرنا چاہتا ہے کرے۔ خدا اس کی نفس کی کوششوں کو کامیاب کرے مگر اسکے بعد کہیں پر خواب غفلت نہ طاری ہو جاوے۔

رکنیت کانگریس کی (۴) مہاتما گاندھی نے کانگریس کی ممبری کی ایک شرط بنانا یہ بھی شرط قرار دی تھی کہ ہر ممبر روزانہ چھوڑا سا سوٹ چرنے میں کاتا کرے۔ مہاتما مدوح غالباً

اس ملک کے پالیٹکس میں روحانیت کے جزو کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس ملک کو اپنا سابق سکھارتن پوشی کے معاملہ میں دوسرے ممالک کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان خود اپنی سعی و کوشش سے اپنی ضرورتوں کو فراہم کرنے کا عادی ہو۔ اور تن آسانی کی بجائے غنتی بنے لیکن ہندوستان میں اتحاد قائم رکھنے کی اہمیت اگر اس سے کم نہ خیال کی جائے تو ہم اس حد تک بھی کہنے کو تیار ہیں کہ کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بھی شرط لگونی چاہیے کہ ہر ممبر اتحاد پر ایک مضمون لکھ کر کسی اخبار میں شائع کرے یا کانگریس کمیٹی میں پیش کرے۔ ممکن ہے کہ بعض ناظرین اس تحریک کو مذاق سمجھیں یا مخالفتیں کو تسلیم وجود نفاق کی بحث کا ایک شکوہ ہے تاہم آجائے لیکن مسئلہ کی اہمیت تو اسی کی تقاضی ہے کہ قبل اسکے کہ ایسی کانگریس میں جو انڈین اور نیشنل کہلاتی ہے شرکت کی کوئی جگہ

و درخواست پیش کریں وہ اتحاد و اتفاق کے مسئلہ پر غور فرما کر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر لیں اور کم از کم یہ ہو کہ ممبری کے فارم میں اتحاد کی کوشش کرنے کا اُن سے اقرار ہی لے لیا جائے۔

یکجا تعلیم دلانا (۵) ہم کو ہندو مسلمانوں کے علیحدہ علیحدہ مدارس کا اصول ہی ناپسند ہے۔ پہلے زمانہ میں دوستی و محبت و

انفیت کی گرہ کتب ہی میں دی جاتی تھی۔ ہم کو ایسے بچپن کا زمانہ یاد ہے کہ اپنے ہم کتب ہندو بچوں سے کٹ کر کے پھر کیسے جلد مل جایا کرتے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسی طرح یہ ہمارے بچے پھر ساتھ ساتھ پیڑ میں۔ کیونکہ جو تعلقات اور روابط اس عمر میں قائم ہو جاتے ہیں ان کا توڑنا دشوار ہوتا ہے۔ ہم نے مذہبی تعلقات سے یونیورسٹیاں علیحدہ علیحدہ قائم کر لی ہیں۔ یہ تو عجیبی بات تھی۔ مذہب کے نام سے ایسے بڑے

بڑے دارالعلوم قائم کرنے کے لئے روپیہ لیتا تھا اگر جہاں تک ممکن ہو ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ ہمارے ہندو مسلمان بچے ایک ساتھ تعلیم پائیں نہ الہ آباد کا ایچ پیٹ شالہ کالج کا دروازہ مسلمانوں پر بند ہو اور نہ لکھنؤ کے مسلم ہائی اسکول میں ہندوؤں کا داخلہ ممنوع ہو۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ اس وقت کوئی فرق کیا جاتا ہے۔ ہم صرف یہ جانتا نا چاہتے ہیں کہ یہ عام اصول ہمارے ذہن نشین رہیں۔

سوشل ایف (۶) ہمارے قدیم تمدن میں جو ملنے جلنے کے مواقع تھے، طرز معاشرت میں یگانا وہ تو اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ محلے محلے میں شام کے وقت

اکھاڑوں کو جائے ہجرت لڑکوں کے وہ جھڑپ اب نظر نہیں آتے
 بہارتے وہ کم خرچ بالائین سستے سستے کہیل اور ورز شیں کہیں دکھائی
 نہیں دیتیں۔ تبدیلی ترقی کی شرط ہے۔ لیکن اب کلب لائف میں
 نئی روح پونچنے کی کوشش کرنی چاہئے اور منہروں اور مسلمانوں کے
 ملنے جلنے کے مواقع میں جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہئے۔ اجنبیت
 سے معاشرت بڑھتی جاتی ہے اس کو متواتر ملنے سے محبت میں اضافہ
 ہونے کی غرض سے مٹانا چاہئے اگر خود نوش میں ہی شریک ہو جائے
 تو کیا کہنا تھا۔ خیر وہ وقت جلد آ رہا ہے۔

جدگانہ انتخاب (۷) اتحاد قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو جدگانہ
 انتخاب کے حق میں ہدف نہ لگانا چاہئے۔ یہ بھڑپوں

کا چھتہ ہے ۱۹۶۷ء کی کانگریس منعقدہ لکھنؤ میں جو قرارداد مسند ویاور
 مسلمانوں کے درمیان قرار پائی تھی اس سے بہتر ہماری سمجھ میں یہ بات
 نہیں آئی اس کے طے کرنے میں جو جو دشواریاں محسوس ہوئی تھیں وہ
 اس وقت بھی ہمارے دماغ میں تازہ ہیں۔ ہم کو اس سال کانگریس
 کی استقبالی کمیٹی کے ایک سکرٹری ہونے کا فخر تھا اور کسی حد تک
 اندرونی کارروائیوں سے بھی ہم واقفیت رکھتے ہیں ہم کو انتخاب
 و بنگال کے مسلمان بھائیوں سے جنہوں نے اس قرارداد کے خلاف نہیں
 کہیں آواز بلند کی ہے یہ بات کہنا ہے کہ جو اصول اس وقت طے کئے
 گئے تھے وہ تمام ہندوستان کی مجموعی حالت کے اعتبار سے تھے کوئی

خاص صوبہ ہمارے پیش نظر نہ تھا۔ اس فیصلہ کی عمر (۸) برس کی بوجھلی اور سرور زمانہ سے انہیں اور چٹکلی پیدا ہوتی جائیگی اگر وہ کسی فیصلہ کو قطعاً نہیں سمجھتے اور قدامت کی کوئی وقت انکی نگاہ میں نہیں ہے تو ہماری رائے میں ہمارے مسلمان بھائی اپنے پانوں میں آپ کھڑی ہمارے ہیں۔ ہر چیز جو آج وہ تیار کر رہے گے وہ کل پلٹ دی جائیگی۔ تو قدیم روایات کا قایم رہنا دشوار ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو بعض منہ و براہ و ران و وطن سے بھی جو آج تک مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کے اصول کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کچھ کہنا ہے۔

اس وقت تمام دنیا کی کامیاب حکومتوں پر نظر ڈالی جائے کہ کیونکر وہ کامیاب ہیں۔ بطور مثال ہم انگلستان ہی کو لیتے ہیں اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ برٹش پارلیمنٹ کی تعریف کرو تو ہم یہ کہیں گے کہ انسانی متضاد قوتوں اور کششوں کو ایک جگہ جمع کرنے سے جو معتدل و درمیانی انسانی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی برٹش پارلیمنٹ ہے اس کو ہی حکومت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ کچھ لیبرل (Liberal) اور کنسرویٹیو (Conservative) اور کچھ لیبر (Labour) ممبرس جب لیبر گورنمنٹ ہو جاتی ہے تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ہر امر کا فیصلہ اپنی اصلی رائے کے مطابق کر سکے گی بلکہ لیبرل اور کنسرویٹیو ممبروں کی متضاد کششیں اس کو درجہ اعتدال پر قایم رکھتی ہیں ہمارے رائے میں متضاد کششوں کا قایم رہنا برٹش پارلیمنٹ کی راج رواج ہے

اگر ان قوتوں کو نکال ڈالئے تو برٹش پارلیمنٹ کا تصور ہی مفقود ہو جائیگا اور جو کامیابی آج اس انگریزی حکومت کو حاصل ہے وہ ہرگز نہ رہے گی۔ اب انگلستان کو چھوڑ کر ہندوستان پر نظر ڈالئے یہاں بھی متضاد کششیں اور قوتیں موجود ہیں البتہ انکی نوعیت بدلی ہوئی ہے ہماری رائے میں ہندوستان کی حکومت اس وقت کامیاب ہوگی جب اہل ہند ان متضاد کششوں کے وجود کو تسلیم کر کے اپنا پارلیمنٹ بنائیں گے۔ اگر اس ملک نے اپنی اسمبلی (Assembly) یا پارلیمنٹ کی تنظیم ایسی کر دی کہ مسلمانوں کے مخصوص جذبات اس کو جادہ اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے کام نہ آسکے تو وہ حکومت ہماری رائے میں نقش بر آب کی مصداق ہوگی۔ یہ تضاد ایسا نہیں ہے کہ اس سے مجموعی حیثیت سے ملک کا نقصان ہو۔ ہمارے ہندو بھائی یہ کبھی خیال نہ کریں کہ ہندی مسلمان اس ملک کے مفاد کو کسی دوسرے اسلامی ملک کے مفاد کے تابع کر دیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوا اور یہ محال ہے۔ اس ملک کے مسلمان اپنے اصلی فائدہ کو سمجھتے جا رہے ہیں اس مسئلہ پر ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ اسی باب کے حصہ دوم میں ظاہر کر چکے ہیں البتہ ایک ہی ملک میں ہر ہندی مسلمان اپنی ترقی کے سامان کر رہے ہیں اور دوسریں برابر رہنا چاہتے ہیں۔ انکی ترقی ملک کی ترقی ہے۔ ان کا تنزل ملک کا تنزل ہے۔ یہ تو اگر ہندو

ہوتا تو مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی نسبت یہ ہی رائے دینا کہ اس معطل کرنے والی قوت کو قائم رکھئے۔ ہماری حکومت میں یہ چھٹے فرورگزاقت کے قابل نہیں ہے۔ اتحاد قائم رکھنے کی اور یہی چھٹے دوسری تدابیر میں جو اس وقت میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔

میں مسلمانوں میں بہاری رائے میں مہذب و مسلمان بڑے بڑے سیاسی مسائل میں ایک ہی نقطہ کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ گزشتہ

(۳۰) برس سے جو حالات ہم خود دیکھ رہے ہیں ان سے

ہماری رائے قائم ہوئی ہے۔ ہم کو ۱۸۹۸ء کا ایک واقعہ کبھی نہ بھولے گا۔ اُس سال کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں تھا۔ ہم کانگریس کی استقبالی کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ لکھنؤ جیسے شہر میں ہماری شرکت سے مسلمانوں کو بڑا استعجاب ہوا۔ اُسی زمانہ میں ایک روز جب ہم اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو چھٹے ممبر مسلمان احباب نے ہم کو دیکھ کر ہماری شرکت پر مذاق اڑانا شروع کیا اور ہم سے طنزاً اس طرح مخاطب ہوئے۔

”اے جناب! ممبر کمیٹی استقبالی نہیں کانگریس“ پندرہ برس کے بعد ہم نے دیکھا کہ انہی میں ایک حضرت کا شمار کانگریس کے بہت بڑے حامیوں اور لیڈروں میں ہو گیا اور اب یہ ایک عظیم جلیلہ پر ممتاز ہیں۔ ایک زمانہ سید احمد خاں مرحوم کا تھا جب کہ نہ صرف کانگریس بلکہ تمام سیاسی مجالس میں مسلمانوں کی شرکت

کفر سمجھی جاتی تھی۔ اُس کے بعد نواب مشتاق حسین و تار الملک بہادر مرحوم کی کوشش سے مسلم لیگ قائم ہوئی جسکی بابتہ لوگوں کو ابتدا میں یہ بدگمانی ہوئی کہ وہ کانگریس کی مخالف ہوگی لیکن رفتہ رفتہ وہ ان تحریکات کی آواز باز گشت کا کام کرنے لگی جو کانگریس کے پیٹ فارم سے منظور ہوتی تھیں۔ آج وہ زمانہ ہے کہ مسلمان کانگریس میں منہم ہو رہے ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ بھاری پائے میں وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت انگریزی کے مقابلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اغراض مشترک ہیں۔ ہندوستان کو جس قدر حقوق عطا ہونگے اُن سے بالآخر ہندوستانیوں کا فائدہ ہوگا۔ علاوہ بریتش کی آخری کامیابی قانون قدرت میں داخل ہے اگر یہ بات صحیح ہے کہ بغیر سیاسی اتحاد کے ہندوستانیوں کو سبوتاج ہو سکتا اور بغیر سبوتاج یا ہندوستانی حکومت کے اس ملک کے تمدن میں اصلی ترقی نہ ہوگی اور کوئی ہندی بحیثیت ہندوستانی کے بیرون ہندوستان کوئی وقعت نہیں رکھے گا۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر دکھلایا جا چکا ہے تو یہ سچ بات کسی نہ کسی روز ضرور سمجھ میں آئے گی۔ اگر انسان سچ بات کو خود نہیں سمجھتا تو دنیا کی مصیبتیں اسکو سکھا دیتی ہیں۔ دنیا کے تلخ تجربے سچائی کا سبق دیدیتے ہیں لیکن ایک دن سچ ضرور غالب ہوتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے اور یہی وجہ ہمارے اس اتحاد کی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے

سیاسی اتحاد ہو کر رہے گا۔ مسلم لیگ بھی رہے گی۔ کانگریس بھی رہے گی۔ مگر ان دونوں جماعتوں کا سیاسی مرکز ایک ہی ہو جائیگا۔ اور جن باتوں میں فرق رہیگا ان کا تعلق صرف اندرونی یا بیرونی معاملات سے ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ گزشتہ صفحات میں ہم نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ مستقل اتحاد قائم کرنے کے لئے مدارس کے ابتدائی درجوں میں عہدِ منورہ و عہدِ مغلیہ کی صحیح تاریخ جو ہندوستان کی ہمیشہ مہذب ترین

لیکن کوئی تاریخ ہند اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک گزشتہ دو سو برس کا حال ہی اُس میں نہ ہو یعنی جب سے عہدِ مغلیہ کا دور ختم ہوا اور درجہِ بدی کی بنیاد پڑی ہم نے بہت کچھ اپنے قدیم تمدن کی ثناء و خوانی کی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی چال بازیوں کو دکھایا ہے اور پچھلے ابواب میں ان اثرات اور قوتوں پر اظہارِ رنج و افسوس کیا ہے جو ہماری صنعت - حرفت - دولت - تجارت - ثروت - فایزِ الہامی - انفرادی - خودداری کو اڑالے گئیں۔ اور اس غرض سے کہ ہندو مسلمان میں اتحاد قائم رہے یہ بھی بتایا ہے کہ عہدِ مغلیہ کی نسبت اہلِ منورہ کا کیا نقطہ نظر ہونا چاہئے اور مسلمان کس نظر سے اہلِ منورہ کو دیکھیں لیکن قلم

اٹھانے کے ملک ہندوستان کے موز کو اس کا تصفیہ بھی کرنا ہوگا کہ اس کو موجودہ حکمرانوں کو کس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے صحیح واقعات کا لکھ دینا ایک اور بات ہے اور ان واقعات کو ناظرین کے روبرو پیش کرنے کا طریقہ امر دیگر ہے۔ کسی واقعہ کے پیش کرنے کا طریقہ ہی وہ ہے جس میں موز کے جذبات ناظرین کے دل و نرا اپنے گلے کہلایا کرتے ہیں۔ موجودہ حکمرانوں کے زمانہ کی تاریخ لکھتے وقت اس بات کا خوف ضرور ہے کہ ہماری قومی آزادی و خودداری کے چمن جانے سے اور صنعت و حرفت کے ٹٹنے سے جو جذبات و جوش پیدا ہوں وہ کہیں صداقت کا خون نہ کر دیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ صداقت ہر چیز کی مضبوط بنیاد ہے۔ جو عمارت صداقت پر مبنی ہے وہ کبھی منہدم نہ ہوگی یوں تو جوش اور جذبات کی لہر اس سنگ صداقت سے بہت کچھ ٹکرائیں گی مگر یہ پتھر ایسا گراں وزن ہوگا کہ اس کو بڑے سے بڑا طوفان بھی جنبش نہ دے سکے گا۔ یہ بڑا اخلاقی جرم ہوگا کہ ہم ان نقصانات کا تو ذکر کریں جو موجودہ حکومت سے ہم کو پہنچے ہیں اور ان فوائد کا اعتراف نہ کریں جس سے ہم مستفید ہو رہے ہیں اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم بھی اس جرم کے مرتکب ہونگے جسکی فرد و قاردا جرم ہم ان مورخین پر لگا رہے ہیں جو عہد مغلیہ کے صحیح صحیح واقعات درج نہیں کرتے۔ یہ ایک اصولی بات ہے جس کا پیش نظر رکھنا ہندوستان کے موز کا فرض ہوگا۔

یوں تو ہر مورخ کے خیالات علیحدہ علیحدہ ہونگے لیکن موجودہ
انگریزی حکومت کی نسبت یہاں جو خیالات ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں
ہم اپنے خیال کو اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر جسٹس منڈے
کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اور اب پھر مختصر
الفاظ میں اس کے اعادہ کی معافی چاہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندو
ایک منزل مقصود کی طرف بڑھا جا رہا ہے جس کے بہت سے درمیانی
منازل ہیں جن میں طبع عہد ہندو کے بعد عہد مغلیہ اس کی ایک ضروری
طے شدہ منزل تھی اسی طرح موجودہ انگریزی حکومت کی منزل کا
طے کرنا بھی قاعدہ مطلق نے ضروری کیا تھا۔

ہم موجودہ حکومت کو اصلی ڈرامے کا ایک سین یا منظر سمجھتے ہیں
عہد مغلیہ کے ہار شاہ کی ذات و مذہب کا جو جذبہ مقناطیسی ہو کر دل پر
ہو تو ہڑی دیر کے لئے اس سے قطع نظر کر کے ہم دنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں
انسانوں کے باہمی تعلقات میں کیا کیا تغیرات ہو رہے ہیں جمہوری
انسان کا پایہ کیا بلند ہوتا جا رہا ہے جو شخص دوسرے کو چھو نہیں سکتا
تھا آج وہ دوسروں کو اپنے ساتھ کہانے کی دعوت دے رہا ہے۔
ہر حکومت میں ایسا جو انتظامی شاخیں قائم ہو گئیں یا قائم ہوتی
جا رہی ہیں اس کے ایک شعبہ کی نگرانی ہی ایک دماغ قابل اطمینان طریقے
سے نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کل حکومت کا انتظام پھر نقل و حمل کے
ذرائع میں جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اس لئے اس دنیا کی

تمام حکومتوں میں جو باہمی تعلقات منسلک ہوتے جا رہے ہیں وہ ایک کہیں باریک جال کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ہر تاریہ نگاہ رکھنا ایک دماغ سے ممکن نہیں۔ ان واقعات کا جو اثر ہر ملک کی طرز حکومت پر پڑا ہے وہ ظاہر ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں حکومت کی قوت انسانوں میں اس طرح تقسیم ہو گئی کہ باید و شاید۔ کیا ایسا اس سے صحیح سکنا تھا؟ ہرگز نہیں۔ پہلے اس میں یہ تبدیلی کیونکر نہ ہوتی؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کو پیدا کرنے کے لئے قادر مطلق نے ہر ملک کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ دنا امریکہ فرانس۔ روس۔ جرمنی۔ یونان۔ چین۔ ترکی۔ اور ایران کے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے حالات پر نظر ڈالئے۔ کہیں کشت و خون کی مدد سے کہیں خلاقی قوتوں کے زور سے کہیں حکمتِ علی سے حکومتوں کے تغیرات کا ایک ہی سین و منظر اس دنیا کے تہیہ میں ہم کو دکھایا جا رہا ہے۔ ہم اس وقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک سچے مورخ کو ہندوستان میں انگلستان کی حکومت کس نقطہ نظر سے دیکھنی چاہئے۔ اور اسی وجہ سے یہ واقعات لکھے جا رہے ہیں۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ جزیات سے قطع نظر کر کے لمبڈ پر وازی کرے اور ہر قدرت کا سامان دیکھے۔

خدا کی زبان اس عالم کے واقعات ہیں اور ان واقعات میں کچھ ایسا تسلسل ہے کہ ہر منزل پر پہنچنے کے بعد جب ہم پیچھے ہٹ کر

دیکھتے ہیں تو نتائج کا ایک نیا سماں نظر آتا ہے مسئلہ ملک جو واقعات
 گزرے اُن سے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ ظالم ایسٹ انڈیا کمپنی
 ہندوستان میں کیوں کی ایک صدی کے بعد مسئلہ عالم اسباب
 کے عجیب و غریب ڈرامہ کا سلسلہ کچھ سمجھ میں آنے لگا اب گزشتہ چوبیس
 برس میں جو تغیرات دیکھتے دیکھتے ہمارے سامنے دنیا میں ہو چکے تھے
 ان پر ہم غور کرتے ہیں۔ زار (صحیح) روس کی نسل کا نام
 و نشان نہ رہا۔ قیصر جو مہنی لکڑی کی تجارت کر رہا ہے سلطانِ ترکی
 اپنی لبرال اوقات میں دوسروں کا دست نگر ہے۔ شاہ ایران برس
 میں کھل تماشے میں مصروف ہے۔ یونان کا فرمانِ روا جلا وطن
 کیا گیا۔ چین کا بادشاہ تاس کے بادشاہ سے زیادہ قوت نہیں کہتا
 یہ وہ عبرتناک واقعات ہیں جو پچیس برس قبل ہمارے خوابِ خیال
 میں بھی نہیں آ سکتے تھے اب ان پچیس برس کے واقعات کو اس کے قبل کے
 ڈیڑھ سو برس کے واقعات کیساتھ ملا کر دیکھئے۔ بالخصوص امریکہ و
 فرانس کے واقعات موضح کا فرض ہے کہ آئندہ کے لئے مسئلہ یا مثبتہ
 واقعات سے نتیجے اخذ کرے۔ قوموں کی حیات و ممات کے متعلق
 صحیح نتائج وہی ہونگے جن کی طبیعتِ ان واقعاتِ عالم سے موجود قدرت
 خدا سے دراصل ظہور پذیر ہوئے۔ خدا اپنا ارادہ اسی عالم اسباب
 اور انہیں واقعاتِ عالم کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے۔ جب ہم نتیجہ نکالنے
 اور اپنی رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

نہ صرف بلکہ تمام دنیا میں طریقہ حکومت کا بدلنا قادر مطلق کی اسکیم اور پروگرام میں داخل تھا۔ پھر بھلا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کی سطح متشعہ کیجا سکتی تھی۔ ہماری رائے میں ہندوستان میں طریقہ حکومت بدلنے کا مقصد حاصل کرنے کے لئے قادر مطلق نے انگلستان کو یہاں مسلط فرمایا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو ہندوستان نے اس دور حکومت میں سیکھی وہ یہ ہے کہ حکومت کی قوت مختلف افراد میں تقسیم کر کے وہ حکومت زیادہ مستحکم کیونکر بنائی جاسکتی ہے انفرادی و اجتماعی حیثیت سے کام کرنے کے اصول کی اس حکومت نے ہم کو سکھایا یورپ و امریکہ نے جب قدر سوسائٹیاں اور جماعتیں معاملات دیوبی کو زیادہ مکمل طور سے انجام دینے کے لئے قائم کر رکھی ہیں انہی مثال دنیا کے قدیم تمدن میں نہیں ملتی۔ ہم یہ طریقہ بھی انگلستان کے ذریعہ سے سیکھ رہے ہیں۔ اس سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انگلستان دراصل اسی غرض کی تکمیل کے لئے ہم پر مسلط کیا گیا ہے ابتداء میں کچھ ہی حالت تھی مگر اس میں شک نہیں کہ اپنا نتائج ہند میں انگلستان کی پوزیشن (Position) اور حیثیت ایک امین یا معلم کی سی ہو گئی ہے۔

ہندوستان میں انگلستان ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین ہمارا اصلی پوائنٹ (Point) اور مقصد کو پیش نظر رکھیں اس وقت ہم کو نہ ہوتا گا نڈھی کے نان کو اپریشن Non Cooperation

یعنی ترک موالات سے تعلق ہے اور نہ نپڈت سر نو اس سٹاسٹری کے
 کو آپریشن (Cooperation) یعنی موالات سے بحث ہے۔ اس
 حصے میں شروع سے ہم اپنا یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ ہندو مسلمانوں
 میں مستقل اتحاد قائم کرنے کے لئے اسکی بڑی ضرورت ہے کہ ہندو زمانہ
 و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جس میں کچھ جھپٹا یا نہ گیا ہو لڑکوں کو پڑھائی جائے
 جسکی مفصل کیفیت بیان ہو چکی اسی کے سلسلہ میں ہم اپنا خیال اس امر
 کے متعلق بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دور موجودہ یعنی انگلستان کے
 کا زمانہ بھی ہمارے بچوں کے سامنے کیونکر پیش کئے جائیں ہم یہاں
 بھی بحث موزع منافقت سے متنفر ہیں۔ ہم صرف اصولی طور سے یہ
 بیان کر سکتے ہیں کہ بچوں کے دلوں میں پہلے سے کوئی زہر ڈالنا اور اس
 سے ان کو متاثر کرنا مناسب نہیں۔ موزع کے فرائض بہت مقدس ہیں
 اسکی ذمہ داریاں اہم ہیں۔ اسکو صرف صداقت کے راستے پر چلنا چاہیے
 اس راستے میں کہیں کہیں دشواری ضرور پیش آئے گی لیکن وہ ناگزیر ہے۔
 مثلاً یہ سچ ہے کہ انگلستان ہم کو نیا طرز حکومت سکھار رہا ہے۔ ہندوستان
 کے نقل و محل کے ذرائع و تجارت میں روز افزوں ترقی ہے۔ بڑے بڑے
 جہاز ساحل ہندوستان پر مال و اباب سے لدے ہوئے تیار کھڑے ہیں۔
 ریلیں اور موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز اڑتے نظر آ رہے ہیں
 ہندوستان ہزاروں میل کے فاصلہ سے تار اور بے تار دونوں کے ذرائع
 سے اپنے معاملات دیگر ممالک سے چند منٹ کی گفت و شنید میں طے

کر رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی صح ہے کہ اس موجودہ دور کے قبل ہم اپنے پیروں پر کھڑے تھے اور اپنے ہی پاؤں سے چلتے پھرتے تھے۔ اب نئی رفتار و طرز حکومت کے سکھانے جانے کے بعد میں ہم ابھی تک اننگلی کوڑا کر چلائے جا رہے ہیں۔ جہازوں میں مال تو ہے مگر جب مال کا بندل اور صندوق کھول کر دیکھتے ہیں تو اُس میں ہماری دولت و صنعت و حرفت متقابلہ بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ مال کسی اور کا ہے۔ ریلیں اور موٹریں تو ہیں مگر ہم انکے انجنیئر نہیں ہیں بلکہ ابھی شوگر کا کام انجام دے رہے ہیں اور اہوائی جہازوں کا انجنیئر بنانا تو درکنار اس کے شوگر بھی ہم نہیں ہیں۔ صرف دھور سے تماشہ دیکھنے والے ہیں۔ مار اور بے تار کی خبروں کے معاملہ میں ہم ہمہ تن متوجہ کھڑے ہیں۔ بنانا تو درکنار ابھی سمجھنے کی بھی قابلیت ہم کو نہیں۔ ان سچی باتوں کے نہ ظاہر کرنے میں اسی قسم کی افراط و تفریط ہوگی جو بعض چھوٹے مغلیہ کے مورخ اُس کے عیوب دکھا کر اسکی خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مورخ جادہ اعتدال و صداقت پر رہیں اور ہم ابھی انگلستان سے تا امید بھی نہیں ہیں۔ صح تو یہ ہے کہ مغرب ابھی مشرق کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں۔ بعض اوقات دیکھا ہے کہ جن قومی اوصاف کو ہم اپنی خوبیوں میں شمار کرتے ہیں ان پر مغرب انگشت زانی کرتا ہے اور جن باتوں کو ہم عیوب میں داخل کرتے ہیں ان کو اہل مغرب فیشن میں

ہند کی علامات سمجھتے ہیں علاوہ انہیں ہمارے موجودہ حکمرانوں پر ایسی ہیبت و شرمناک
 آ رہی ہے کہ ان کے آمدنی و کسے پر شدتی قوموں کی تاریخ اور زندگی میں سچ دیکھ سوچیں
 ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جن کی زندگی دو سال - انگلستان نے ہندوستان
 سے شہرہ کے قدر کے موقع پر ایک ملکہ معظمہ کی زبان کے ذریعہ سے
 کچھ وعدہ کیا تھا اور پھر ۱۹۱۷ء میں جنگ عظیم کی مصیبت کے وقت
 اس وعدہ کی توثیق ایک دو کتبہ جلیل القدر ہند شاہ کی زبان سے کرائی
 اس دور کے یہ سب بڑے کارنامے ہیں اگر انگلستان نے یہ وعدے خود
 پورے کئے تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے بچے اور ہماری نسلیں احسان و
 شکر گزاری کے بارگراں سے کبھی بکدوش نہیں ہو سکتے دنیا کی تاریخ
 میں اس کی مثال ملنا دشوار ہوگی - ہماری دولت صنعت - حرفت خود دار
 وقت اور کیر کمر میں حالت محکومی ہے جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی
 و خانہ پرستی ایفاء وعدہ سے جلد ہو جائیں گی لیکن اگر بالآخر واقعات
 و حادثات عالم کے زور نے وعدہ پورا کر لیا تو اس میں شک نہیں کہ
 تاریخ کا آخری فیصلہ ہی ہوگا کہ انگلستان پر خود غرضی کی انسانی کمزوری
 غالب آگئی تھیں وہ اپنے بارامانت کو برداشت نہ کر سکا - یوں تو
 اس دنیا کی قدرتی قوتیں عمل کر رہی ہیں - ہندوستان کے مستقبل و
 بنی نوع انسان ہی ایک نہ ایک دن ضرور ٹھکانے لگیں گے - ہماری تاریخ
 میں موجودہ دور اس طرح گزر جائیگا جیسے کسی لذیذ پلاؤ کے تیار کرنے
 میں پیچ کا اہل ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے مقابلہ

انگلستان کی اہلیت و قابلیت کا آخری فیصلہ تاریخ اسی بنیاد پر رکھی کہ اُس نے اپنے دور میں ہمارا پایہ بحیثیت انسان بلند کیا یا ستحق ہماری جانب ہے اور ہم کو امید ہے کہ انگلستان کا کیرکٹر بالآخر حق کا ساتھ دیگا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ہم اپنے طالب علموں کے سامنے انگلستان کے کارناموں کا کہنا نہ بلکہ نا نہیں چاہتے۔ دورِ غلیہ کا کھاتا تو بند ہو چکا ہے لیکن موجودہ دور کا کھاتا رواں ہے۔ ہماری راکیں ابھی ہندوستان کے موح کو آخری واصلباتی نہ نکالنی چاہتے۔ موجودہ دور کو ہم نہ شب تار سمجھتے ہیں اور نہ روز روشن۔ ہماری امیدیں ابھی انگلستان سے وابستہ ہیں۔ ہماری راکیں ہندوستان کے موح کے لئے یہی سچا اور صحیح راستہ ہوگا۔

مکمل ہے کہ اس کتاب میں کوئی عبارت ایسی موجود
 ناظرین میں سے کسی کے خلاف مزاج ہو اگر ایسا ہو تو اس
 کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ میری عرض اس کتاب سے اتحاد
 پیدا کرنا نہ کہ نفاق۔

گواہ شاہیہ سے میں رکھا گیا حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ
 کی خدمت کرنے میں مصروف ہوں لیکن اس کے بل کچھ عرصہ تک ہندو
 کے پالیٹکس (Politics) کے میدان میں کچھ بادیہ پیمانی
 اور خاک بینی کر چکا ہوں۔ میں اس کو بخوبی محسوس کر رہا ہوں کہ
 ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقاتی کا سیاسی اثر ہم پر کیا ہوگا۔ یہی اندیشہ

اس کتاب کے لکھنے کا محرک ہوا ہے۔ اگر اس مقصد کے حاصل کرنے میں
 عشرِ شیر ہی کامیابی ہوئی تو میں یہ خیال کروں گا کہ میری کل محنت
 وصول ہو گئی۔ بالآخر ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم انسان تیرے
 بندے کمزور ہیں۔ بغیر تیری مدد کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اے خدا
 مدد کر۔ اور اس ملک کے تمام باشندوں میں اتفاق پیدا کرنا کہ اسکی حق
 سے ہم منزل مقصود تک پہنچ سکیں فقط

سید علی ہاشم

۱۹۲۴ء ۱۰ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ

ختم شد

قطع تاریخ طبع کتاب ہذا

دار مولوی اسد اللہ حسینی صاحب مدینہ دار مجلس عالمہ دارالکتاب

مندرجہ ذیل مطبعین مسجدیں مسلم مطبعین تھے بے الم ہندو مسلمان عہدِ مالکیر

تاریخ لکھنے پر مل سکی نواب زبیر خانک ہندو مسلمان ایک تھے یا علی مالکیر
 ۱۳۴۴ھ ۱۳۴۳ھ



